لکھنؤ

تعمیر حیات

پندرہ روزہ

۲۵/اگست ۲۰۰۳ء

مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیش کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کرسکنے کو دخل ہے، وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے، اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں، اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا، سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا"۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

(کاشی ودیا پیٹھ، بنارس کے جلسہ تقسیم اسناد کے خطبہ سے ماخوذ، ۱۴/اگست ۱۹۳۵ء)

7/-

Fortnightly
Tameer-e-Hayat
Regd. No- LW/NP/63
R.N.I. No-.UP.URD/2001/6071
August 2003
Nadwatul Ulama, Lucknow-226 007
Vol.2, Issue No: 10

حیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر دلآویز و فکر انگیز مضامین کا مجموعہ

صفحات:—۱۸۸ قیمت:—۶۰ روپے

نقوش سیرت

از: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء، و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

ملنے کا پتہ:

مکتبہ حسنی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی میموریل سنٹر، حیدر آباد

Ist Floor A.N.S.Plaza Beside Mallepally Mosque
Hyderabad-500001

CHIKAN SQUARE

چکن امپوریم

چکن کپڑے کا شوروم

تقریبات کے موقع پر آپ کی خدمت کے لئے حاضر

Chikan Square

Exclusive Chikan, Party Wear & Handicraft

7, Subhash Marg, Near C.S.M.M.U, Lucknow-3
Ph : 2266491 Mobile 9415025056
e-mail : chikansquare@yahoo.com

Ph. Nos 2260433- 2242946

جدید و دلکش سونے چاندی کے زیورات کے لئے

ہمارے شوروم میں

آپ کا خیر مقدم ہے

گہنہ پیلیس

Gahna Palace

حاجی عبدالرؤف خاں، حاجی محمد فہیم خاں محمد معروف خاں

ایک مینارہ مسجد کے سامنے اکبری گیٹ چوک لکھنؤ

طلباء اور تاجران کتب کے لئے خاص رعایت

تاج

اسلامک جنتری دستیاب ہے

ہر قسم کے قرآن مجید مترجم، غیر مترجم، حمائل، قاعدے پارے، پنج سورے، عربی، فارسی، اردو کی درسی غیر درسی نیز ہائی اسکول انٹر، جامعہ اردو علی گڑھ کی گائیڈ اور ٹیس پیپر وغیرہ بہترین اور مناسب قیمت میں ہم سے طلب کریں۔

نوٹ: آپ اپنی ضرورت کی کتب بذریعہ ڈاک بھی طلب کرسکتے ہیں۔

تاج بکڈپو، اکبری گیٹ، چوک، لکھنؤ

Shop: 2216948
Resi : 2227443

ریڈی میڈ مردانہ ملبوسات کا قابل اعتماد مرکز

اعلیٰ و جدید ترین فیشن کے ساتھ

Shirts, Trousers, Coat-Suits,
Embroidered, Sherwanis, Pullowers,
Jackets, Kurta-Suits,
Night Suits, Gowns & Ties.

شادی بیاہ، تیوہار اور تقریبات کے لئے شاندار ذخیرہ، تشریف لائیں

men mark®

58, Halwasia Market, Hazrat Ganj, Lucknow

صبا کا ہیئر آئل

حسنی فارمیسی

چشمہ ساگر

ہمارے یہاں کمپیوٹر کے ذریعہ آنکھوں کی جانچ کی جاتی ہے۔

AUTO REFRECTO METER AR-860

ایک بار خدمت کا موقع دیں

آپٹیشین: اے۔ رحمن (علیگ)

Editor : Shamsul Haq Nadwi Office Ph : 2787250 (Ext.) 18, Guest house : 2740151, Fax 91-522-2787310, 2788376
Printed & Published By Athar Husain on behalf of Nadwatul Ulama at Parekh Offset Printing Press, Tagore Marg, Lucknow -20 Ph : 2789966

تعمیر حیات لکھنؤ

پندرہ روزہ — اشاعت کے ۴۰ر سال

۲۵ر اگست ۲۰۰۳ء مطابق ۲۶ر جمادی الاخریٰ ۱۴۲۴ھ — شمارہ نمبر-۲۰

(جلد نمبر ۴۰)

زیر سرپرستی:
حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

نگران خصوصی:
حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی
(معتمد تعلیم، ندوۃ العلماء لکھنؤ)

پروفیسر وصی احمد صدیقی
(معتمد مال، ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر عام	رئیس التحریر
مولانا شمس الحق ندوی	امین الدین شجاع الدین
معاون	معاون
ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی	محمود حسن حسنی ندوی

مجلس مشاورت
- مولانا نذر الحفیظ ندوی
- مولانا عبداللہ حسنی ندوی
- مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری

زر تعاون

سالانہ -/۱۵۰ ——— فی شمارہ -/۷

ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک -/۳۵ر ڈالر

- ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات لکھنؤ کے نام سے بنائیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

Tameer-e-Hayaat

Past Box No. 93, Nadwatul Ulama Lucknow-226007

فون (دفتر) 18 (Ext) 2787250 مہمان خانہ 2740151 (0522)

Website : www.nadwatululama.org

e-mail : Nadwa@sancharnet.in

thetameer-e-hayat@nadwatululama.org

مضامین ومندرجات سے متعلق سارے امور میں رئیس التحریر سے خط وکتابت کی جائے اور انتظامی امور میں مدیر عام سے رجوع کریں۔

پرنٹر پبلشر اطہر حسین نے پارکیہ آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ٹیگور مارگ، لکھنؤ میں طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع کیا۔

Paras Computers Ltd. Ph: 3115571

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس شمارے میں

مضمون	مصنف	صفحہ
بسم اللہ الرحمن الرحیم		
رئیس التحریر کی میز سے	ا-ش	۲
اداریہ		
جرم ضعیفی کی سزا	مولانا عبداللہ عباس ندوی	۳
روبرو		
یکساں سول کوڈ کا مسئلہ کس حد تک باعث فکر ہے؟ مولانا محمد رابع حسنی ندوی سے ایک گفتگو	ا-ش	۴
تعمیر حیات کی فائل سے		
قرآن کریم کا موضوع: دعوت وہدایت	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	۶
سخن دلنواز		
نسل نو کے ایمان وعقیدہ کی فکر کیجیے	مولانا محمد رابع حسنی ندوی	۹
رابطہ ادب اسلامی		
ابن فرید کی نگارشات	ڈاکٹر شفیق احمد خان	۱۴
تعلیم الحدیث		
عقیدۂ رسالت	مولانا بلال عبدالحی حسنی	۱۵
اسلام اور سائنس		
قرآن حکیم اور موجودہ نظام شمسی	پروفیسر قمر اللہ خاں	۱۷
صحبتے با اولیاء		
مولانا شاہ محمد عبدالرحیم مجددیؒ	مولانا واضح رشید ندوی	۲۰
فکر ابوالحسن علی ندوی		
مولانا ابوالحسن علی ندوی کی مکتوب نگاری	ڈاکٹر شمس تبریز خاں	۲۳
عالم اسلام		
عراق کا دشمن کون؟	مولانا نذر الحفیظ ندوی	۲۵
اصلاح معاشرہ		
ولادت کے بعد تحنیک سنت ہے	مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری	۲۸
تعارف وتبصرہ		
علی قلی تہرانی، حیات اور کام	پروفیسر وصی احمد صدیقی	۲۹
شعر وادب		
حمد ومناجات	صوفی عبدالربؒ	۳۰
کتابوں کی دنیا	مولانا محمود حسن حسنی ندوی	۳۱

دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ اس شمارہ کے ساتھ آپ کا زر تعاون ختم ہو چکا ہے، ازراہ کرم سالانہ زر تعاون ۱۵۰ر روپے ارسال فرما کر ممنون کریں۔

فکر امروز

ہر تمدن کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم کرلیا جائے

ہندوستان کے سیاسی ماحول میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات سے زیادہ کوئی چیز شرمناک نہیں، فرقہ وارانہ بلووں میں، جو آئے روز رونما ہوتے ہیں، لوگوں کے جان ومال کی تباہی اور قاتلانہ حملوں کی مذمت میں کوئی زبان زیادہ سخت نہیں ہوسکتی، شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہوگا کہ جب ہم ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں اس طوفان خیز حادثہ کی خبر نہ سنتے ہوں، یہ حادثات اپنے پیچھے نفرت اور تلخی کے ایسے جذبات چھوڑ جاتے ہیں جو ملک کو ان برسرپیکار گروہوں کے بڑے بھاری کیمپ میں بانٹ دینے کی دھمکی دیتا ہے، کہ جو ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہوں، ان ہی کی بدولت کانگریس اپنی مقبولیت کھو بیٹھی ہے، اکثر صوبوں میں اسے ثانوی حیثیت میں دھکیل دیا گیا ہے، اور جنگجو فرقہ وارانہ انجمنوں کو اولین اہمیت حاصل ہوگئی ہے، ہمیں اس صورت حال کو زیادہ عرصہ تک برقرار رہنے کی اجازت نہیں دینا چاہیے، ہندو مسلم اختلافات کے مسئلہ کا ہمیشہ کے لیے تصفیہ کردینا چاہیے۔

ہندو مسلم اختلافات کو دور کرتے ہوئے ہمیں اس بیماری کی علامات کا غلط اندازہ نہیں لگانا چاہیے، یہ سیاسی اور مذہبی اختلافات جنہوں نے دو اقوام کے تعلقات کو ناگوار بنا رکھا ہے، اس گہری کشمکش کی بظاہر شکلیں ہیں، جو ہندوستان کے لیے خاص عجوبہ یا تاریخ کے لیے نیا واقعہ نہیں، یہ دراصل دو مختلف تمدنوں کا مسئلہ ہے، جو زندگی سے متعلق اپنا مخصوص زاویۂ نگاہ رکھتی ہیں، اس کا بہترین حل یہ ہے کہ ہر تمدن کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم کرلیا جائے، ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور عزت کی اسپرٹ کو بیدار کیا جائے، اور ایسے قومی اداروں کے قیام سے کلچرل یگانگت کو فروغ دینے کے کام کی حوصلہ افزائی کی جائے، جن میں دونوں اقوام کے بچے ایک دوسرے کے ساتھ ملیں جلیں، اور دونوں تہذیبوں کی تہ میں موجود تصورات کو سمجھنے، اور مطالعہ کرنے کے مواقع سے فیض یاب ہوں، تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو مغربی تہذیب کے مطالعہ پر مجبور کیا جاتا ہے، مگر وہ ان لوگوں کی تہذیب سے تقریباً کورا ہوتا ہے جو اس کے گھر کے پاس ہمسایہ میں رہتے ہیں، یہ وقت ہے کہ ہمیں اس خطرناک علیحدگی اور عظیم جہالت کا قصہ پاک کردینا چاہیے، ایک دوسرے کے گہرے جذبات کے علم اور ایک دوسرے کے تصورات کے لیے ہمدردی کے جذبہ سے فرقہ وارانہ نمائندگی کے مسائل مثلاً گائے کشی اور مسجدوں کے سامنے باجہ بجنے کے جھگڑے ماضی کی داستان بن جائیں گے، اور ان کی اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہ رہ جائے گی کہ ہندوستان کی تاریخ کے محقق ان کے اسباب کی تحقیق کرتے رہیں۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

(ماخوذ: خطبۂ صدارت، اجلاس انڈین نیشنل کانگریس، مدراس-۱۹۲۷ء)

رئیس التحریر کی میز سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

آج تھوڑی دیر کے لئے ایک مردِ حکیم کی اس بات کو ذہن میں تازہ کرلیجئے کہ کسی قوم کی شوکت پہ زوال تو بعد میں آتا ہے، اس کی قوت فکر و عمل پہلے فنا ہوتی ہے...

..... یہ سب درست کہ ہم مسلمان حق کے علمبردار ہیں اور باطل ہم سے برسرِ پیکار ہے لیکن ضرورت اس کا جائزہ لیتے رہنے کی ہر حال میں باقی رہتی ہے کہ ہماری قوت فکر و عمل کا کیا حال ہے اور خدانخواستہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خود ہمارے اپنے فکر و عمل کے نتیجہ میں بھی ہم نقصان اٹھا رہے ہیں۔

آزادی کے بعد سے حالات و عوامل کچھ ایسے پیش آتے رہے کہ ہمارا مزاج صدائے احتجاج بلند کرنے اور جلد اشتعال قبول کرنے کا بنتا چلا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''کرمفرماؤں'' نے ہماری اس کمزوری سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اور ہم زخم پر زخم کھاتے رہے، مذہبی جذبات سے وابستہ مسائل وقفہ وقفہ سے چھیڑے جاتے رہے تاکہ بآسانی ہمیں مشتعل کیا جاسکے اور اس طرح انہیں اپنے مذموم مقاصد حاصل ہوتے رہیں۔

مذہب و تشخص سے جڑے ہوئے مسئلوں کو چھیڑتے رہنے کا سلسلہ اب بھی جاری ہے البتہ اس سلسلہ میں ملت کا یہ رویہ خوش آئند قرار دیا جاسکتا ہے کہ ان مسائل کے ردعمل کے اظہار میں مسلمان اب اشتعال پسندی کا رویہ نہیں اپناتے بلکہ کوشش..... حکمت عملی و ہوش مندی اور تحمل سے کام لینے کی ہوتی ہے۔

آزادی کے بعد سے مسلمانانِ ہند کے ساتھ یہ ہوتا رہا کہ بعض مسائل کو عیاری اور چابکدستی سے اس طرح پیش کیا گیا جیسے ان مسائل کا تعلق صرف مسلمانوں کے مذہب سے ہے اور وہی اس کے مخاطب ہیں جب کہ اس مسئلہ کے دوسرے پہلو (مثلاً معاشی و اقتصادی پہلو) بھی ہوا کرتے اور دوسروں کے مفادات براہ راست اس سے وابستہ ہوتے (جس کی ایک مثال گئوکشی کے مسئلہ کی ہے) مگر مسلمان اپنی سادہ لوحی، عجلت پسندی اور سہل نگاری کے مزاج کی وجہ سے اس مسئلہ کو صرف مسلمانوں کا مسئلہ بنالیتے اور عداوت مول لے لیا کرتے۔

الحمد للہ ادھر ایک عرصہ سے ہم آپ دیکھ رہے ہیں کہ اگرچہ مذہب و تشخص سے وابستہ حساس مسائل سامنے آتے رہے، ملت نے نوٹس بھی لیا، غیرت و حمیت کا ثبوت بھی دیا البتہ اس فرق کے ساتھ کہ احتجاج و اشتعال کے رویہ کو اپنا کر نہیں بلکہ حکمت و تحمل کی روش کو اختیار کرتے ہوئے........ روش و رویہ اور سوچ و فکر میں یہ مثبت تبدیلی خوش آئند بھی ہے اور اس حقیقت کی عملی تائید و توثیق بھی کہ ''الحکمۃ ضالۃ المومن'' کہ حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے۔

ہمیں مسرت ہے کہ تازہ شمارہ کا اداریہ ہمارے مخدوم و مربی استاذ الاساتذہ مولانا عبداللہ عباس ندوی کے قلم سے ہے۔ ''یکساں سول کوڈ کا مسئلہ کس حد تک باعث فکر ہے؟'' کے موضوع پر صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ مخدومنا المکرم مولانا محمد رابع حسنی ندوی سے ایک اہم انٹرویو اس شمارہ کی زینت ہے۔ اس شمارہ کے لئے ہم نے کچھ پھول چنے ہیں، جب پھول کا ذکر آتا ہے تو اس کے ساتھ ذہن کے پردے پر اور بھی دوسرے الفاظ ابھرنے لگتے ہیں مثلاً گل چیں، صیاد، باغبان!!.......وغیرہ۔

اس شمارہ کے مضامین آپ پڑھیں گے تو انشاء اللہ ان میں پھولوں کی خوشبو تو محسوس ہوگی ہی لیکن اس کے ساتھ اس بات کا بھی احساس ہوگا کہ ان میں کہیں تو گل چیں اور صیاد سے خبردار کیا گیا ہے اور کہیں باغباں کی جگر کاوی اور دلسوزی اپنا اثر دکھا رہی ہے اور اس طرح تعمیر حیات کا حالات سے باخبری و آگہی کا یہ سفر جاری ہے۔

اسی ہفتہ ہم طلبہ و اساتذہ کو جمعیۃ الاصلاح کے جمالیہ ہال میں مخدوم و مربی مولانا عبداللہ عباس ندوی مدظلہ العالی کی زبانی ان کا اپنا ایک بیش قیمت مقالہ ''قرآن کریم اور سیرت نبوی میں ''حسن ادب'' کی اہمیت'' سننے کی سعادت نصیب ہوئی، مولانائے محترم کی تازہ ترین تصنیف ''تاریخ تدوین سیرۃ النبیؐ'' کا یہ ایک باب ہے، کتاب طباعت کے مرحلہ میں ہے اور ہم سب اسے زیور طبع سے آراستہ ہوکر دیکھنے اور پڑھنے کے لئے سراپا منتظر ہیں، اعجاز قرآن پر بھی موصوف کی تصنیف کا اہل علم کو انتظار ہے، اور اب ''مقامات حجۃ اللہ البالغہ'' کا موضوع مولانا کے پیش نظر ہے۔

گزشتہ دنوں مرکز نظام الدین سے علماء کرام کی لکھنؤ تشریف آوری ہوئی... ..... ندوہ میں طلبہ و اساتذہ میں ان حضرات علماء کرام کے مختلف پروگرام ہوئے اور یہ احساس تازہ کر گئے کہ۔ ع

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

والسلام
آپ کا بھائی
امین شجاع

ادار یہ

جرم ضعیفی کی سزا

(مولانا) عبداللہ عباس ندوی

دل کو جیسے چاہئے سمجھا لیجئے، جو تاویل ممکن ہو کرلیجئے، ہماری اجتماعی حالت اس بچے سے زیادہ ہوش مندی کی نہیں ہے جو جاڑوں میں رضائی کے اندر سر ڈھک کر یہ سمجھتا ہے کہ اب ہم بھوت پریت، چڑیل سب سے محفوظ ہوگئے، یا وہ شتر مرغ جس کا کوئی پیچھا کرتا ہے تو وہ اپنا سر ریت میں چھپا لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ہم خطرہ سے نکل گئے۔

اس وقت پورا عالم اسلام ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک خونخوار و بدکردار، بے رحم اور آدم خور حیوانوں کے پنجہ میں ہے، کسی کو اگر چند روز کی مہلت مل گئی ہے تو وہ بھی ایک سیاست ہے، سیاست نہ کہئے چالبازی اور فریب کاری ہے۔

ایک شطرنج کے کھلاڑی کی بات سنی تھی، اس نے کہا کہ مہروں کا بساط پر آگے پیچھے رکھنا ''چال لگانا'' نہیں ہے، چال لگانا اس کو کہتے ہیں کہ آپ اپنے مقابل کو ایسی چال چلنے پر مجبور کریں جو آپ چاہتے ہیں، اور پلاننگ کے مطابق اس کو مات دیجئے۔

ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھئے، ذلت و رسوائی، قتل و غارت گری کے بادل گھر گھر کے آرہے ہیں، اگر کہیں منٹ دو منٹ کا سکون حاصل ہے تو وہ سکون نہیں ہے، آندھی کے آنے سے پہلے جو سناٹا چھایا کرتا ہے اسی طرح کا ایک سناٹا ہے کسی صاحب ضمیر سے پوچھئے، حالات سے باخبر انسان سے پوچھئے کہ

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

کیا مشرق بعید اور یورپ اور امریکہ کے باشندوں سے ہم زیادہ چیرہ دست ہیں؟ ہمارے فسق و فجور کے اڈے کیا اس طرح ''منظم'' بنائے گئے ہیں جیسے بینکاک اور نیویارک میں تیار کئے گئے ہیں۔

یہ بھی نہیں ہے، اور قطعاً نہیں ہے تو پھر آپس کا انتشار ہے، ''کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْن'' کا معاملہ ہے، یہ بھی ہم سمجھتے ہیں، اور سمجھ کر اس کا علاج بھی کرتے ہیں، ایک نئی جماعت قائم کرلیتے ہیں جو ''واعتصموا'' کی دعوت دیتی ہے، جو جماعتیں پہلے سے موجود ہیں ان کے علاوہ ایک مزید ''مسجد ضرار'' کا اضافہ ہوجاتا ہے، نتیجہ یہ کہ

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

□□□□

یکساں سول کوڈ کا مسئلہ کس حد تک فکر کا باعث ہے؟

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ) سے ایک گفتگو

سوال: یکساں سول کوڈ کے سلسلہ میں سپریم کورٹ نے ایک بار پھر حکومت کو متوجہ کیا ہے اس پر آپ کا ردعمل؟

جواب: سپریم کورٹ کے ایک مقدمہ کے فیصلہ میں متعلقہ ججوں میں سے صرف ایک جج نے اظہار رائے کیا ہے اور مشورہ دیا ہے کہ حکومت کامن سول کوڈ کے لئے کچھ کرے جس کا مطلب یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں اس کے سلسلہ میں بل لاکر قانون بنوایا جائے سپریم کورٹ ایسے معاملہ میں جس میں دستور میں قانون نہ بنایا گیا ہو صرف اتنا ہی کرسکتی ہے جس کی حیثیت قانونی نہیں ہے صرف ایک مشورہ ہے، اب حکومت اگر اس ضمنی مشورہ کو مانے تو اس کو پارلیمنٹ میں بل لانے کی کوشش کرنا ہوگا وہ بل پارلیمنٹ کے ارکان کی اکثریت قبول کرے گی، تب وہ پاس ہوگا۔ پاس ہونے کے بعد وہ قانون قابل عمل ہو سکے گا۔ یہ ایک طویل کام ہے اور اس میں جگہ جگہ دشواری کا اندازہ ہے اسکی وجہ سے عمل بظاہر مشکل ہے۔ حکومت کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ پارلیمنٹ جس میں ہر مذہب کے نمائندے ہیں اور خود ہندو مذہب کے مختلف دھڑوں کے مذہبی رسوم و رواج الگ الگ ہیں، وہ سب کیسے اپنے مذہبی رسوم ورواج کے فرق کو ختم کرنے پر راضی ہونگے اور بل کی تائید کریں گے۔؟

مسئلہ دراصل صرف مسلمانوں کا نہیں ہے یہ مختلف مذاہب کے لئے بھی مسئلہ ہے جس پر ہندوستان جیسے مختلف مذاہب کے پیروکاروں اور ہندو مذاہب کے مختلف ڈھروں کا راضی ہونا بہت ہی مشکل ہے چنانچہ حکومت نے اعلان بھی کردیا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں بل نہیں لائے گی لہٰذا مسلمانوں کو اس سلسلہ میں فی الحال زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مسلمانوں کو ہر مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھ کر احتجاج اور اشتعال کا راستہ نہیں اختیار کرنا چاہئے بلکہ حکمت عملی سے دیکھنا چاہئے جس میں دوسرے فرقوں کے مسائل بھی ہوں، ان میں مخالفت کی ذمہ داری تنہا مسلمانوں کو نہیں لینا چاہئے۔

اس کے علاوہ قوانین کے سلسلہ میں اس فرق کو بھی جاننا چاہئے کہ ایک ہے شہری زندگی، اور دوسری ہے مذہبی وشخصی زندگی۔ شہری زندگی کے لئے جو ضابطے اور قوانین بنائے جاتے ہیں، وہ سب کے لئے مشترک اور عمل کے لائق ہوتے ہیں، ان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز وفرق کا معاملہ نہیں ہوتا۔ اس طرح کے شہری اصول وقوانین دوسرے تمام ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی ہیں جن کی رو سے آپس کی شہری زندگی میں آسانی رہتی ہے اور مشترک معاملات میں ٹکراؤ نہیں پیدا ہوتا۔

البتہ مذہبی معاملات اور انسان کے اپنے ذاتی امور میں جو فرق واختلاف ہوتا ہے سیکولر ملک میں اس کو نظر انداز کر کے قانون مشترک انداز میں نہیں بنایا جاسکتا ہے اور مختلف مذاہب کے ماننے والے اس کو کیسے قبول کرسکتے ہیں سب کے اپنے اپنے عقائد ہیں، اصول ورواج ہیں، مذاہب ہیں اور پھر ان سب کے اپنے اپنے قوانین، اصول اور ضابطے ہیں جن پر عمل درآمد کے وہ پابند ہیں اس لئے یہ بات صاف اور واضح ہے کہ مذہبی امور ومعاملات، مذہبی رسومات میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو کسی ایک بات کے ماننے اور تسلیم کرنے پر مجبور کرنا ایک ناقابل عمل بات ہے اور کوئی اس کے لئے تیار بھی نہیں ہوگا کیونکہ اس طرح اپنے مذہب کو چھوڑنا اور اس کے خلاف بات کو ماننا ہوگا جو ناقابل عمل ہے۔

ہمارا ملک ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے ہیں جن کا اپنا اپنا شخصی اور مذہبی قانون ہے صرف ہندو قوم کو لے لیجئے یہ ایک مرکب قوم ہے اور ان کے رسومات وغیرہ میں بھی آپس میں بہت فرق پایا جاتا ہے اس لئے خود ہندو قوم بھی کسی ایک مشترکہ قانون پر عمل درآمد کے لئے آمادہ نہیں ہوگی۔

اس مسئلہ کی طوالت اور اس کے ناقابل عمل ہونے کو عموماً سب اہل دانش سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود وقتاً فوقتاً اس سلسلہ میں کچھ کہہ دیا جاتا ہے پھر میڈیا ایسا زور باندھتا ہے کہ گویا یہ بھی ایک انتظامی مسئلہ ہے جس کو حکومت فوراً آرڈر دے کر کراسکتی ہے یہ مسئلہ کو نہ سمجھنے کی بات ہے اور اس میں مسلمانوں کو خاص طور پر مخاطب کیا جاتا ہے اور یہ غالباً قصداً ایک دوسرے مقصد سے کیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کو نعرہ کے طور پر استعمال کر کے عام مسلمانوں کو الجھن میں ڈالا جائے اور ان کے خلاف رائے عامہ بنائی جائے تا کہ الیکشن میں فائدہ اٹھایا جاسکے۔ مسلمانوں کو بھی یہ سمجھنا چاہئے اور اس پر مشتعل اور پریشان نہ ہونا چاہئے کیونکہ عملی طور پر یہ جلد کی جانے والی بات نہیں ہے۔

سوال: اس مسئلہ میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کا موقف کیا ہے؟

جواب: موقف بالکل صاف اور واضح ہے اور یہ بات بھی صاف کردینے کی ہے کہ جب ہم اپنے موقف کی

بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ہمارا کسی دوسرے مذہب سے کوئی ٹکراؤ ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ اسلام نے ہمارے لئے جو اصول وضابطے اور طریقے مقرر کردئے ہیں، ان پر عمل درآمد کے لئے ہم پابند ہیں، یہ قانون الٰہی ہے اور قانون الٰہی میں ترمیم و تنسیخ کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں۔

جہاں تک دستور ہند کی بات ہے تو وہ بھی اس کا حق دیتا ہے اور اس سے اس موقف کی تائید ہوتی ہے۔ رہی بات دفعہ ۱۴۱ کی، تو لوگ یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ اگر یہ قابلِ عمل ہوتی تو دستور ساز خود اسے طے کردیتے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں اگر تبدیلی کے ارادہ کو قانونی طور پر آگے بڑھانے کی کوشش کی جاتی رہی تو ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ دستور اور ملک کے سیکولرزم کے اصولوں کی بنیاد پر اقلیتوں کو جو مذہبی آزادی دی گئی ہے اس کو ختم کرنے کی یہ کوشش ہے جو ہمارے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ہمارے معاملہ میں کی جارہی ہے۔ ملک میں ہمارے ہم وطنوں کی ایک خاصی تعداد بھی ایسی ہے جو ایسی کسی کوشش کو ملک کے مزاج ودستور کے خلاف سمجھتی ہے اور امید ہے کہ وہ اس اقدام کو روکنے میں اقلیتوں کا ساتھ دیگی۔

اس وقت یہ مسئلہ اصلاً پریس نے بڑھایا ہے ورنہ اگر واقعی قطعی ارادہ وکوشش کا موقع آیا تو مسلم پرسنل لاء بورڈ کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس بات کی بھرپور کوشش کرے کہ ہمارے شخصی وعائلی قوانین اور مسلم پرسنل لاء میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کی جاسکے اور اس مقصد کے لئے جو بھی دستوری، جمہوری اور قانونی طریقے ہوسکتے ہیں، ان کو وہ اپنائے۔

سوال: شنکر اچاریہ صاحب سے آپ کی ملاقات اور مراسلت کو لے کر میڈیا میں گزشتہ دنوں ایک بحث چل پڑی تھی جو الحمد للہ اب تقریباً ختم ہو چکی ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ کچھ رسائل اس موضوع پر اب بھی خامہ فرسائی کررہے ہیں اور یہ تاثر دے رہے ہیں کہ اس قضیہ کے سلسلہ میں خود جناب والا کا رویہ نسبتاً کمزور اور تبدیلی کا تھا جس سے خواہ مخواہ غلط فہمیاں پیدا ہورہی ہیں، کیا آپ اس سلسلہ میں کچھ وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟

جواب: بعض صحافتی ذرائع نے شنکر اچاریہ اور میری ملاقات سے ایسے معنی نکالنے کی کوشش ضرور کی تھی جس سے مسجد کے سلسلہ میں میرے متعلق ان کے قارئین کو غیر اسلامی رویہ اختیار کرنے کا شبہ پیدا ہوا تھا جو خبروں کو صحیح پیش نہ کرنے کی وجہ سے تھا کیونکہ میں نے بار بار صحافتی ذرائع کو اور اپنے رفقاء بورڈ کو یہ بتایا کہ شنکر اچاریہ سے اجودھیا و بابری مسجد کے سلسلہ میں میری کچھ بھی بات نہیں ہوئی۔ انہوں نے بات کرنا چاہا تھا اس پر میں نے اپنی طرف سے کچھ کہنے سے معذرت کردی اور ان کو اپنی بات لکھ کر بھیجنے کو کہا تا کہ بورڈ کی عاملہ تک اس کو پہونچا دیا جائے اور میں نے کہا کہ میں اس کے سلسلہ میں کوئی رائے نہیں دیتا اور سنجیدہ پریس میں میری یہ وضاحت صحیح طور پر شائع بھی ہوئی ٹائمز آف انڈیا اور پی۔ ٹی۔ آئی نے یہ وضاحت شائع کی۔ بورڈ چونکہ انہی شنکر اچاریہ سے گزشتہ سال گفتگو کرچکا تھا جس میں ان کی تحریری تجویز پر غور کیا گیا تھا جس میں مسجد کے سلسلہ میں مسلمانوں کے موقف کی تائید کی گئی تھی کہ اس کا فیصلہ کورٹ پر چھوڑا جائے۔ بورڈ نے کچھ وضاحتیں طلب کی تھیں جن کے نہ آنے پر بات چیت ختم کردی گئی تھی، اس لئے میرا خیال تھا کہ وہ جو تجویز اس بار بھی پیش کریں گے وہ سابقہ کی طرح ہوگی جس میں مسجد کے مسئلہ کو کورٹ پر چھوڑنے کی بات ہوگی جو کہ میں بورڈ کو دے دوں گا، وہ اس پر غور کرے یا مسترد کرے اس کو اختیار ہوگا۔ شنکر اچاریہ اپنی قوم کے بڑے آدمی تھے میری عیادت کو آئے تھے، میں ان کے ساتھ یہی کرسکتا تھا ان سے اس ملاقات سے پہلے اور اس کے بعد بھی حکومت کے کسی فرد سے یا کسی ہندو تنظیم کے کسی شخص سے بابری مسجد کے سلسلہ میں میری نہ کوئی بات ہوئی اور نہ کوئی ملاقات۔ میں نے اس زمانہ میں میڈیا کو بھی جو بیان دئے ان میں بابری مسجد کے متعلق سوال پر اپنی یہی رائے ظاہر کی کہ مسجد کو نہ دیا جاسکتا ہے نہ چھوڑا جاسکتا ہے افسوس ہے کہ اس کے بعد بھی بعض صحافتی ذرائع نے میرے متعلق بدگمانی کا رنگ دینے یا خبر بنانے کا کام کیا اور افسوس زیادہ اس بات کا ہے کہ بعض ذمہ دار مسلم صحافیوں نے بھی تحقیق کا طریقہ اختیار کئے بغیر اس بدگمانی ہی کو ترجیح دی اور اس بدگمانی کو خبر کی شکل دی۔

(امین شجاع)

❁❁❁

اعلان مفقود الخبر

(مقدمہ ۲/۴۳۹)

مدعیہ: ناظمہ بنت عبداللطیف ساکن راج گڈھ ڈاکخانہ گوری گنج ضلع سلطانپور۔

بنام

مدعی علیہ: محمد شہید ولد امام علی منیہار ساکن کراری لچھن شاہ ڈاکخانہ شاہ گڈھ ضلع سلطانپور۔

اطلاع بنام مدعی علیہ

مقدمۂ ھذا میں مدعیہ ناظمہ بنت عبداللطیف ساکن راج گڈھ ڈاکخانہ گوری گنج ضلع سلطانپور نے آپ مدعی علیہ محمد شہید ولد امام علی منہار ساکن کراری لچھن شاہ ضلع سلطانپور کے خلاف غائب ہونے نیز نان ونفقہ ودیگر حقوق زوجیت نہ ادا کرنے کی بناء پر مرکزی دارالقضاء ندوۃ العلماء لکھنؤ میں نکاح فسخ کئے جانے کا دعویٰ کیا ہے، اس نوٹس کے ذریعہ آپ (مدعی علیہ) محمد شہید ولد امام علی منیہار کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ دارالقضاء ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حاضر ہوکر رفع الزام کریں، حاضر نہ ہونے کی صورت میں مقدمہ یکطرفہ طور پر فیصل کیا جاسکتا ہے۔

(مفتی) محمد ظہور ندوی
رکن قاضی کونسل
مرکزی دارالقضاء اترپردیش
ندوۃ العلماء ص، ب ۹۳، لکھنؤ (الہند)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

قرآن کریم کا موضوع: دعوت وہدایت

قرآن کریم ہدایت ودعوت کی کتاب ہے، اوراحکام وشریعت کی بھی کتاب ہے۔ لیکن اس کے اندر دعوت وہدایت کا پہلو دوسرے پہلوؤں پر غالب ہے، شریعت واحکام کی اہمیت سے انکارنہیں، اس کی عظمت سرآنکھوں پرلیکن سوال اولیت واہمیت کا ہے، کون ساپہلو زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اور کس کو اولیت حاصل ہے، اس لحاظ سے اگر دیکھیں تو میرا حقیر مطالعہ یہ ہے کہ شریعت و احکام کے مقابلہ میں دعوت وہدایت کا پہلو قرآن کریم میں غالب ہے، کیونکہ ایمان کی بنیاد ہدایت پر ہے اور تبلیغ پراس ایمان کے حصول کا دارومدار ہے، لہٰذا یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دوسرے تمام مضامین و مقاصد پر ہدایت و دعوت کا عنصر قرآن کریم میں نمایاں طور پر غالب ہے۔

دعوت وتبلیغ کا کام قوانین وضوابط کا پابندنہیں ہے

قرآن کریم نے دعوت وتبلیغ کے کیا اصول بتائے ہیں؟ وہ کیا ضابطے ہیں جن کی پابندی کرنے کا قرآن کریم نے حکم دیا ہے؟ کیا قرآن کریم میں ہمیں تبلیغ و دعوت کے متعین قوانین اور اس کے بے لچک حدود بتائے گئے ہیں۔

میرا خیال ہے دعوت کے طریق کار کو قانون وضابطہ کی زبان میں نہیں کیا گیا ہے، اور ایسا کرنا قرین مصلحت اور مقتضائے حکمت تھا، دعوت وتبلیغ کا انداز ماحول اور گردو پیش کے حالات، مخاطبین کے طبائع اور دین کے مصالح کے مطابق متعین ہوتا ہے۔

چونکہ دعوت کوصورتحال کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور ''صورت حال'' ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، اس لئے دعوت کے کام میں ''حاضر کلامی'' اور ''حاضر دماغی'' دونوں کی ضرورت ہے، مزید یہ کہ دعوت پیش کرنے والوں کو انسانی نفسیات سے گہری واقفیت اوراس کی دکھتی رگوں اور سوسائٹی کے کمزور پہلوؤں پر انگلی رکھ کر بتانا ہوتا ہے، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مبلغ کو یہ بات کرنی چاہئے، یہ نہیں کرنی چاہئے، اور یہ کام کرنا چاہئے، اور یہ نہیں کرنا چاہئے، اس کو ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہئے اور لوگوں کے سامنے دعوت کو اس طرح پیش کرنا چاہئے، اس کے یہ حدود وضوابط ہیں، خواہ وہ قوانین کے مرکزی خطوط ہوں، کیونکہ ہر بدلتے ہوئے معاشرہ اور تبدیل شدہ صورت حال سے اس کو نمٹنا ہوتا ہے۔

> چونکہ دعوت کوصورتحال کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور ''صورت حال'' ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، اس لئے دعوت کے کام میں ''حاضر کلامی'' اور ''حاضر دماغی'' دونوں کی ضرورت ہے، مزید یہ کہ دعوت پیش کرنے والوں کو انسانی نفسیات سے گہری واقفیت اوراس کی دکھتی رگوں اور سوسائٹی کے کمزور پہلوؤں پر انگلی رکھ کر بتانا ہوتا ہے، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مبلغ کو یہ بات کرنی چاہئے، یہ نہیں کرنی چاہئے۔

اگر قوانین وضوابط میں اس کو جکڑ دیا جائے تو وہی حال ہوگا جو ایک صاحب کو اپنے ملازم کے ساتھ پیش آیا تھا، جو ایک لطیفہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ کسی صاحب نے ایک ملازم رکھا، ملازم ضرورت سے زیادہ ''قانونی'' واقع ہوا تھا، اس نے مطالبہ کیا کہ مجھے میرے فرائض بتا اور نوٹ کرادیے جائیں، چنانچہ ایک فہرست تیار ہوئی کہ فلاں وقت بازار سے سودا لانا ہے، فلاں وقت گھر صاف کرنا ہے، فلاں وقت یہ کام کرنا اور فلاں وقت وہ کام کرنا ہوگا، ملازم نے ان خدمات پر اپنے آپ کو مامور سمجھا جن کی تفصیل اس کی فہرست میں درج تھی، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک بار وہ صاحب جنھوں نے ملازم رکھا تھا، گھوڑے پر سوار تھے، وہ اترنا چاہتے تھے، پاؤں رکاب میں پھنس گیا، اوران کی جان پر بن گئی، اب گھوڑا بھاگ رہا ہے اور یہ گھسٹتے ہوئے جارہے ہیں، اسی حال میں ملازم پر نظر پڑی چیخ کر آواز دی کہ جلد آؤ اور میری جان بچا ملازم نے کہا، ذرا ٹھہریئے میں اپنی فہرست میں دیکھ لوں کہ آیا یہ خدمت بھی میرے فرائض میں ہے یا نہیں؟ اس وقت جب کہ آقا کی جان جارہی ہے، اوروہ موت وحیات کی کشمکش میں ہے، ملازم صاحب نے اپنے اصول وضوابط پر عمل کیا اور آقا اسی ضابطہ پرستی کی نذر ہوگئے، اور ملازم ان کے کچھ کام نہ آیا عربوں کو اللہ تعالیٰ نے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی بڑی صلاحیت بخشی ہے، اوران کے اندر فطرۃً سلامت روی پائی جاتی ہے، ان کی شاعری کا یہ خوب شعر ہے۔

اذا کنت فی حاجة مرسلا

فارسل حکیما ولا توصه

یعنی اگر تمھیں کسی کام سے کوئی آدمی کہیں بھیجنا پڑے تو اس کے لیے ایک عقیل وفہیم آدمی کا انتخاب کرلو اوراس کو تفصیلی ہدایتیں نہ دو، کیونکہ وہ خود اپنی سمجھ سے موقع محل کی مناسبت دیکھ کر وہ کام کرلے گا جو تمہارے حقیقی منشاء کے مطابق ہوگا۔

دعوت کے زمانی اور مکانی حدود

دعوت دین بہت نازک کام ہے، اوراس کی وسعت کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اس کے کچھ حدود مکانی ہیں، اور کچھ حدود زمانی اور دونوں انتہائی وسیع اور پھیلے ہوئے، زمانہ کے لحاظ سے دیکھیے تو اس کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ کسی پیغمبر نے دعوت کا آغاز کیایا غیر پیغمبر نے اس دعوت کی ابتداء کی اوراس کی انتہا کوئی بھی نہیں ہے اسی طرح اس کا مقام (مکانی حدود) بھی متعین نہیں کیا جاسکتا، ہوسکتا ہے کہ داعی مشرق میں ہواور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مغرب میں ہو یا مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق میں منتقل ہوجائے، لہٰذا اگر صرف اہل مشرق کو سمجھانے کا طریقہ اس کو معلوم ہے تو مغرب میں وہ افہام وتفہیم کا کام انجام نہیں دے سکتا اور اگر وہ صرف اہل مغرب کے طبائع اور نفسیات سے واقف ہے تو مشرق میں اس کی دعوت برمحل اور بارآور نہیں ہوگی۔

> یہ لفظ ''ادع'' تمام معانی اپنے جلو میں رکھتا ہے، اور حسب موقع داعی دعوت کا فرض کبھی پندونصائح سے کبھی وعظ وتقریر سے اور کبھی تحریر اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے ادا کرسکتا ہے، اور بلانے کا ہر وہ وسیلہ اختیار کرسکتا ہے، جو مشروع ہو، مؤثر اور نافع ہو پھر فرمایا: ''سبیل ربک'' اپنے رب کے رستے (کی طرف)، اس کے علاوہ کوئی تعبیر ممکن نہیں جس میں اتنی جامعیت اور وسعت، گہرائی اور گیرائی بیک وقت موجود ہو۔

آیت دعوت کا اختصار واعجاز، اس کی وسعت اور گیرائی

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے دعوت کے طریق کار کے حدود مقرر نہیں کئے اور یہ کام داعی کی قوت تمیز اور عقل سلیم پر چھوڑ دیا ہے، اس بات کا فیصلہ کہ کب اور کس وقت کون سا طریق کار اختیار کیا جائے اس کی طرف خود داعی کا ذوق اور عقیدہ رہنمائی کرے گا اور اس کی دینی فکر جو اس کے احساسات و اعصاب پر حکمراں ہے، وہ خود طریق کار کا انتخاب کرلے گی، قرآن کریم نے صرف ایک وسیع حصار قائم کردیا ہے، جس کے اندر دعوت دین کی پوری روح (اسپرٹ) سماگئی ہے، وہ آیت یہ ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (النحل/۱۲۵)

''(اے پیغمبر) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو جو اس کے رستے سے بھٹک گیا تمہارا پروردگار اس سے خوب واقف ہے اور جو رستے پر چلنے والے ہیں انھیں بھی خوب جانتا ہے۔''

اس آیت کریمہ کی رو سے دونوں باتیں پوری طرح عیاں ہیں، ایک داعی الی اللہ کو کتنی آزادی ہے اور کس درجہ پابندی ہے کہاں تک وہ جاسکتا ہے، اور کس حد سے آگے قدم بڑھانا ممنوع ہے، جہاں تک دعوت کی وسعت اور داعی کی آزادی کا تعلق ہے وہ اس تعبیر سے واضح ہے کہ ''ادع إلی سبیل ربک'' (بلاؤ اپنے رب کی راہ کی طرف) اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ایمان کی طرف دعوت دو، یا صحیح اور سچے عقیدہ کی طرف بلاؤ، یا نماز قائم کرنے کی دعوت دو، یا اخلاق حسنہ اختیار کرنے کی ترغیب دو، انسانیت کے احترام کی تلقین کرو، یہ سب نہیں کہا گیا مگر یہ تمام باتیں ''سبیل ربک'' میں سمٹ آئی ہیں، اس لفظ نے فکر وعمل کے آفاق کھول دئے ہیں، یہ آفاق بھی محدود نہیں ہیں، اس میں دوسرے ادیان سماوی، بشری ضروریات، انسانی زندگی میں پیش آنے والی حاجتیں سب داخل ہیں ''ادع'' (بلاؤ) کا لفظ بھی کس درجہ وسیع معانی پر حاوی ہے، اس میں نہ اس کی قید ہے کہ وعظ وتقریر کے ذریعہ بلاؤ نہ یہ کہ تحریر کے ذریعہ دعوت دو، نہ یہ کہ وعظ و تلقین ہی کا ذریعہ اختیار کرو، یہ لفظ ''ادع'' تمام معانی اپنے جلو میں رکھتا ہے، اور حسب موقع داعی دعوت کا فرض کبھی پند ونصائح سے کبھی وعظ و تقریر سے اور کبھی تحریر اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے ادا کرسکتا ہے، اور بلانے کا ہر وہ وسیلہ اختیار کرسکتا ہے، جو مشروع ہو، مؤثر اور نافع ہو پھر فرمایا: ''سبیل ربک'' اپنے رب کے رستے (کی طرف)، اس کے علاوہ کوئی تعبیر ممکن نہیں جس میں اتنی جامعیت اور وسعت، گہرائی اور گیرائی بیک وقت موجود ہو۔

''حکمت'' کا لفظ بہت ہی بلیغ اور بڑی وسعتوں کا حامل ہے، دوسری زبان میں اس کا ترجمہ آسان نہیں ہے، اسی طرح ''موعظت'' بھی وسیع معانی پر حاوی لفظ ہے، ''حسنہ'' کا لفظ بھی لامحدود معانی پر مشتمل ہے قرآن نے اس آیت میں آزادی بھی دی ہے، اور حد بندی بھی کی ہے، ایجاز واختصار بھی ہے اور بیان وشرح بھی۔

''اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل/۱۲۵)

''(اے پیغمبر! اپنے پروردگار کے رستے کی طرف دانش اور نیک نصیحت سے بلاؤ)

یہ آیت کریمہ بعثت محمدی سے پیشتر کے سب سے بڑے داعی الی اللہ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں نازل ہوئی ہے، یہ پورا تذکرہ اس طرح ہے:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا، وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ، اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ، وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً، وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ، ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا، وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ

(النحل/۱۲۰-۱۲۳)

''بے شک ابراہیم (لوگوں کے) امام اور خدا کے فرماں بردار تھے جو ایک طرف کے ہورہے تھے اور مشرکوں میں نہ تھے اس کی نعمتوں کے شکر گذار تھے، اور خدا نے ان کو برگزیدہ کیا تھا اور (اپنی) سیدھی راہ پر چلایا تھا اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے، پھر ہم نے تمہاری

طرف وحی بھیجی کہ دین ابراہیم کی پیروی اختیار کرو جو ایک طرف کے ہو رہے تھے، اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔"

اس کے بعد ارشاد ہوا

"اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ" الخ

لہٰذا یہ آیت کریمہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت توحید سے مربوط ہے حضرت ابراہیمؑ کی ذات سے دعوت حق کا کیا تعلق ہے اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ کے ضمن میں اس آیت کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی دعوت میں اسی طریق کار کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے، اور یہ کہ آپ کی دعوت "حکمت وموعظت حسنہ" کے اصول پر کاربند تھی۔

> دعوت کے سلسلہ میں ایک اہم نکتہ ہے جس کو قرآن نے فراموش نہیں کیا ہے وہ یہ کہ دعوت کا کام صرف انبیاء کرام تک محدود نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل سکتا تھا کہ ہم کہاں اور اللہ کے پیغمبر کہاں،

دعوت کا ایک اہم عنصر، واقعات اور مثالیں

قرآن کریم نے دعوت کے لئے واقعات بیان کرنے اور مثالیں دینے کا اسلوب اختیار کیا ہے، دوسرے وسائل دعوت کی بہ نسبت یہ طریقہ زیادہ زود اثر اور دلنشیں ہے اور مقصد کے حصول میں یہ طریقہ زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوا ہے، ایک طرف قرآن کریم نے اگر تفصیلی ضابطے اور قانونی باریکیاں بتانے کو ضروری نہیں سمجھا ہے تو دوسری طرف (اس خلا کو اگر اس خلا سمجھا جائے جو درحقیقت خلا نہیں ہے) انبیاء کرام کی سیرت اور ان کے مواعظ اور دعوت پر مکالموں کے نمونوں سے پر کیا ہے، یہ نمونے دلوں پر اثر اندازی کی بے انتہا قوت رکھتے ہیں، ذہن وقلب پر ان کا سحر کی مانند اثر ہوتا ہے کیونکہ عملی نمونوں کا جو اثر ہوتا ہے وہ کسی دوسرے وسائل دعوت کا نہیں ہو سکتا، منطقی، نفسیاتی، علم کلام کے انداز کے جدلی اصول، دعوت دین کے لئے کارآمد عناصر نہیں ثابت ہوئے ہیں، تمام آسمانی صحیفوں نے شروع سے آخر تک عملی نمونوں پر اعتماد کیا ہے، یہ نمونے اور مثالیں ادبی شہ پارے ہیں جو دلوں کو موہ لیتے ہیں۔

ان میں سے اکثر واقعات چار برگزیدہ پیغمبروں سے ماخوذ ہیں، وہ انبیاء کرام حضرت ابراہیمؑ، دوسرے حضرت یوسفؑ، تیسرے حضرت موسیٰؑ، اور آخر میں خاتم الانبیاء والرسل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

ایک مومن کی دعوت کا نمونہ جو اپنا ایمان مخفی رکھے ہوئے تھا

دعوت کے سلسلہ میں ایک اہم نکتہ ہے جس کو قرآن نے فراموش نہیں کیا ہے وہ یہ کہ دعوت کا کام صرف انبیاء کرام تک محدود نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل سکتا تھا کہ ہم کہاں اور اللہ کے پیغمبر کہاں، وہ لوگ اللہ کی نوازش خاص سے بہرہ مند تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے نبوت اور وحی سے نوازا تھا، روح القدس سے ان کی تائید وتقویت کا انتظام فرمایا گیا تھا، ہم عاجز بندے کس طرح ان برگزیدہ انبیاء کرام کی نقل کر سکتے ہیں، ان کے نقش قدم پر چلنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اس سبب سے ایک مثال ایسے شخص کی دی ہے جو نبی نہیں تھا اور نہ پیغمبروں کے ممتاز اور جلیل القدر ہم نشینوں میں تھا، ایک مومن تھا، فرعون کی قوم کا فرد تھا، قرآن کریم نے صرف اس قدر بتایا ہے۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ یَکْتُمُ اِیْمَانَہٗ (المومن/۲۸)

"اور فرعون کے لوگوں میں سے ایک مومن شخص نے (جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتا تھا) کہا"

یعنی اس کے حالات اور ماحول نے اس کو دین کے اعلان کا موقع بھی نہیں دیا تھا، خواہ وہ ایمان قوت کے لحاظ سے جس قدر بھی بلند رہا ہو مگر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی طرح یا حضرت ابوذرؓ کی طرح اپنے ایمان کا اظہار نہ کر سکا،

> یہ آیت کریمہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت توحید سے مربوط ہے حضرت ابراہیمؑ کی ذات سے دعوت حق کا کیا تعلق ہے اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ کے ضمن میں اس آیت کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی دعوت میں اسی طریق کار کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے، اور یہ کہ آپ کی دعوت "حکمت وموعظت حسنہ" کے اصول پر کاربند تھی۔

لیکن وہ مومن تھے اور اپنے ایمان کو اب تک چھپائے ہوئے تھے انھوں نے اپنے بھائی بندوں کے خلاف جنگ نہیں کی اور ایک دوست، خیر خواہ اور اپنے دوستوں اور بھائیوں کا بھی خواہ بن کر انھوں نے دعوت دین کا فرض انجام دیا، ایک صاحب ادراک وبصیرت داعی کے لئے اس واقعہ میں ایک نمونہ ہے، اگر وہ اسی صورت حال سے دوچار ہو اور دینی مصلحت کا تقاضہ ہو اور اس شخص کے لئے بھی نمونہ ہے جو اگرچہ ایسی صورت حال سے دوچار نہیں ہے مگر کلام کے انداز اور حقیقت سے آگاہ کرنے کا اسلوب ماضی کے عبرتناک واقعات اور انجام کار کے نتائج سے باخبر کرنے کا طریقہ اس واقعہ سے اخذ کر سکتا ہے۔

وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی (النسا/۹۵)

"اور اللہ نے ان دونوں طبقوں کے لئے بہتر نعمتوں کے وعدے کئے ہیں۔" ●●●

نسل نو کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کیجئے

دار العلوم فرقانیہ سہسرام کے جلسہ میں

حضرت مولانا محمد رابع حسنی کا ایک دردمندانہ خطاب

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمد وعلیٰ الہ وصحبہ اجمعین : وبعد

بزرگو اور دوستو! میں اس شہر میں پہلی بار حاضر ہوا ہوں، یہاں آکر مجھے خوشی ہوئی، یہاں جو مسلمانوں کا نشاط ہے، اور جو ان کی دلچسپیاں ہیں ان کو دیکھ کر ان سے اچھی امید قائم ہوتی ہے۔

احساس کی ضرورت

صورت یہ ہے کہ ترقی کے لئے سب سے پہلے احساس کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کو اپنی کمزوری کا احساس ہو، اپنی ضرورت کا احساس ہو اور اس بات کا احساس ہو کہ اس کے اوپر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے،! احساس بڑی چیز ہے اور احساس ہی کے بعد دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دئے گئے ہیں اور دئے جاتے ہیں، بعض وقت انسان غافل ہوتا ہے، احساس سے خالی ہوتا ہے، اس کی طرف اس کا ذہن ہی نہیں جاتا، اس ضرورت کی طرف، اس تقاضے کی طرف یا اس کمی یا کمزوری کی طرف جو اس میں ہوتی ہے اور اچانک کسی واقعہ سے احساس پیدا ہوتا ہے اور پھر انقلاب آجاتا ہے اور وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

> اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ان کو اس بات کا احساس ہوا کہ ہم اقلیت میں ہیں، اگر ہم دوہری محنت نہیں کریں گے اور اگر ہم پوری توجہ سے کام نہیں لیں گے تو ہم اکثریت کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں،

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا واقعہ

حضرت سیدنا عمر بن عبد العزیز مدینہ منورہ کے گورنر تھے، شروع میں تو گورنر کی حیثیت سے رہتے تھے اور بہت خوش پوشاک تھے، اور خوشبو وغیرہ لگانے کے عادی تھے اور بہت ہی اچھے اور معیاری انداز میں زندگی گذارتے تھے حتی کہ ان کی چال تک لوگوں کو پسند آتی تھی اور ان کے چلنے کے طرز کا نام پڑ گیا تھا "المشیۃ العمریۃ" یعنی عمر بن عبد العزیز والی چال اور لوگ رشک کرتے تھے لیکن جب ان کو خلافت ملی تو ایک دم سے ان میں تبدیلی آگئی اور وہ بالکل بدل گئے اور اپنی زندگی کو انہوں نے اس طرح بدل دیا کہ ان کے پاس عیش وآرام کا جو بھی سامان تھا سب ترک کر دیا اور سب غریبوں کو دے دیا اور بہت ہی معمولی اور تنگی و عسرت کی زندگی اختیار کر لی، تاریخ میں آتا ہے کہ انکی صاحبزادیاں بہت پریشان رہتی تھیں، ان کو کھانے کو ٹھیک سے اور پسند کا نہیں ملا کرتا تھا، ایک مرتبہ جب وہ اپنی بیٹیوں سے ملنے آئے تو دیکھا کہ بیٹیاں اپنے منھ کو ہاتھ سے دبائے ہوئے تھیں، انہوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ معلوم ہوا کہ کھانے کے لئے کچھ تھا نہیں تو پیاز کھا کر گذارا کر لیا اور اس خیال سے کہ والد صاحب کو اس کی مہک سے تکلیف نہ ہو، منھ پر ہاتھ رکھ لیا تھا تو حضرت عمر بن عبد العزیز رو دئے اور کہنے لگے بیٹیو! اگر تم لوگ چاہو اور اس بات کو پسند کرو کہ تمہیں تکلیف ہو اور تمہارا باپ جہنم سے محفوظ رہے اور جنت میں جائے تو تمہاری عنایت ہوگی یعنی میں تم کو تمہاری پسند کا کھانا دے تو سکتا ہوں لیکن میں اس قابل نہیں ہوں اور نہ میں ایسا کر سکتا ہوں، اور پھر انہوں نے ایسی حکومت کی کہ مثال قائم کر دی اور کہنے والے کہنے لگے کہ خلفائے راشدین چار نہیں پانچ ہیں اور پانچویں عمر بن عبد العزیز ہیں اور یہ عمر بن عبد العزیز وہ تھے جو پہلے بہت ہی خوشحالی کی زندگی گذارتے تھے بات کیا تھی؟ احساس ہوا جب خلافت ملی تو ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا اور شدید احساس ہوا اور بالکل ان کی زندگی بدل گئی اور انہوں نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔

مسلم اقلیت کی ذمہ داری

تاریخ کی بہت ساری شخصیات میں آپ کو یہ بات ملے گی کہ ان میں احساس پیدا ہوا اور تبدیلی آگئی اور وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے، تو احساس بہت ضروری چیز ہے، تھوڑا بھی ہو تو اس کا فائدہ ہوتا ہے، اور زیادہ ہو تو زیادہ فائدہ ہوتا ہے اور ہماری قوم میں اس وقت سب سے زیادہ کمی احساس ہی کی ہے، یعنی ہم اپنے اردگرد دیکھ رہے ہیں کہ دوسری قومیں ترقی کر رہی ہیں اور دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے مقاصد میں لگے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف بہت سی سازشیں ہو رہی ہیں اور گویا کہ سب اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ مسلمانوں کو آگے نہیں بڑھنے دینا ہے اور ان کو پیچھے کر دینا ہے اور اس کے لئے بڑے بڑے پروگرام بن رہے ہیں، اگر آپ میگزین، اور اخبارات کا پابندی کے ساتھ مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کیسی سازشیں ہو رہی ہیں اور سب کی توجہ مسلمانوں کی طرف ہے کہ اس دنیا سے مسلمانوں کو مٹا دیا جائے یا مٹایا نہ جائے تو ان کو پیچھے کر دیا جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ان چیزوں کا بہت کم احساس ہے، علم ہی نہیں ہے اور نہ وہ اس کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں نہ اس کی فکر کرتے ہیں، اور متعدد قومیں جو اقلیت میں ہیں ایسی ہیں جن کے نام کی صراحت کی

ضرورت نہیں کہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ان کو اس بات کا احساس ہوا کہ ہم اقلیت میں ہیں، اگر ہم دوہری محنت نہیں کریں گے اور اگر ہم پوری توجہ سے کام نہیں لیں گے تو ہم اکثریت کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اکثریت کو تعاون اور سرپرستی کے لئے دوسرے وسائل حاصل ہوتے ہیں لیکن اقلیت بہت سی چیزوں سے محروم ہوتی ہے، اور یہ طبعی اور فطری بات ہے اس لئے اقلیت کو دوہری محنت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اگر وہ دوسروں سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں یا دوسروں کی سطح پر چلنا چاہتے ہیں، تو اس وقت مسلمانوں کو ہمارے اس ملک میں اس کی بڑی ضرورت ہے، وہ یہ سمجھیں کہ ان کو دوہری محنت کرنی ہے اور کن میدانوں میں کرنی ہے؟ اور ان کا احساس صحیح ہو جائے کہ وہ کس پوزیشن میں ہیں اور اس پوزیشن سے نکلنے کے لئے ان کو کیا کرنا چاہئے؟

جنوبی افریقہ میں نسل نو کے ایمان وعقیدہ کے لئے فکرمندی:

میں نے جنوبی افریقہ کا سفر کیا اور وہاں کے حالات معلوم کئے تو معلوم ہوا کہ مسلمان وہاں اقلیت میں ہیں لیکن ان میں سے اکثر پڑھے لکھے ہیں اس لئے کہ ان کو احساس ہے اور اندازہ ہے کہ ان کی پوزیشن کیا ہے، اور ان کو کیا کرنا چاہئے؟ تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ انہوں نے تعلیم کے میدان میں جو تقاضا ہے اور جو ضرورت ہے اس کو پورا کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کر رکھے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ تعلیم کی کیا اہمیت ہے؟ اس زمانہ میں تعلیم کے بغیر کوئی انقلاب نہیں لایا جا سکتا ہے اور نہ بڑے مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں اور جو جماعتیں اور قومیں تعلیم میں پیچھے ہیں وہ دنیاوی زندگی میں بھی پیچھے ہیں بلکہ وہ بلند مقاصد کے حصول میں بھی پیچھے ہیں چونکہ اکثریت دوسروں کی ہے، تو ایک تو وہ اسکول اور کالج ہیں جو گورنمنٹ کے ہیں وہاں حکومت کا نصاب ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ مسلمان اپنے دین کی حفاظت کے لئے مدرسے قائم کرتے ہیں اس طرح انہوں نے تعلیم کی ضرورت کے جتنے پہلو ہیں، ان تمام پہلوؤں کو اپنے سامنے رکھا ہے۔

ایک تو یہ ضرورت ہوتی ہے کہ بچہ جب مکتب میں جائے یا اپنے گھر کے ماحول میں ہو تو اس کے دماغ میں عقائد بٹھا دئے جائیں، ابتدائی تعلیم میں یا گھر کی تعلیم میں جو بات سکھا دی جاتی ہے اور بتا دی جاتی ہے وہ دل ودماغ میں راسخ ہو جاتی ہے اور وہ جڑ پکڑ لیتی ہے پھر بڑی سے بڑی آندھیاں اس کو آسانی سے نکال نہیں سکتیں، اور اس کے بہت سے واقعات ہیں، یہاں اس کا موقع نہیں ورنہ اس کی مثالیں دی جا سکتی ہیں گھر کے اندر آدمی جو عقیدہ اور جو رجحان لے لیتا ہے وہ قائم رہتا ہے اور بعد میں مدد دیتا ہے، ایک ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ گھر میں اور گھر کے باہر مکتب میں ابتدائی تعلیم میں اس کے دماغ اور ذہن میں عقائد اور اپنی قدریں جو بنیادی ہیں بٹھا دی جائیں اور ان بنیادی قدروں سے تعلق بٹھا دیا جائے، حسن سیرت کی ضروری

> دینی تعلیم کے مدرسے جتنے طلبہ کو تعلیم دیتے ہیں ان کی تعداد دو تین فیصد سے زیادہ نہیں،

باتیں اس کے دل میں بٹھا دی جائیں اب اس کے بعد وہ جب آگے کی تعلیم میں اگر ایسی تعلیم میں بھی جاتا ہے جس میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کوئی ہم آہنگی نہیں ہے تو بھی اس کا دین، اس کے عقائد اور اسکی قدریں بڑی حد تک محفوظ رہیں گی، دور نہیں ہونگی۔

دوسرا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے کہ طالب علم جب اسکول وکالج میں چلا جاتا ہے اور وہاں تعلیم حاصل کرتا ہے اکثر بچے گورنمنٹ کے قائم کئے ہوئے مدارس ہی میں جاتے ہیں اس لئے کہ پرائیویٹ طریقے سے اتنا بڑا انتظام نہیں ہو سکتا ہے تو ان کی بھی فکر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے علاوہ دینی تعلیم کا مسئلہ یہ ہے کہ امت کو جو اعلیٰ دینی مسائل ومعاملات کی ضرورت ہے ان کو وہ علماء پورا کر سکتے ہیں جنہوں نے دین کی پختہ اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہوتی ہے، تو امت کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ اس کے پاس ایسے علماء ہوں، مفتی ہوں، فقہاء ہوں، اور ائمہ ہوں جو اس کی اعلیٰ دینی ضرورتوں کو پورا کر سکتے ہوں اور یہ بغیر ان کی اچھی تعلیم کے نہیں ہو سکتا ہے، تو ہم نے دیکھا کہ انہوں نے ان ساری باتوں کی رعایت کی ہے، ان کے یہاں ایک تو وہ مدارس ہیں جن کو دینی مدارس کہتے ہیں، عربی مدارس کہتے ہیں جہاں علماء تیار کئے جاتے ہیں، مفتی تیار کئے جاتے ہیں اور وہ جو دین کی اعلیٰ ضرورتوں کو پورا کر سکتے ہوں وہ تیار کئے جاتے ہیں ان کی ایک تعداد بہر حال امت کے لئے ضروری ہوتی ہے اور ہندوستان میں جو بہت سے مدرسے قائم ہوتے ہیں ان پر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اتنی تعلیم کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن ان کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ دینی تعلیم کے مدرسے جتنے طلبہ کو تعلیم دیتے ہیں ان کی تعداد دو تین فیصد سے زیادہ نہیں، یہ دیکھنے میں بہت معلوم ہوتا ہے لیکن اگر آپ مجموعی تعداد میں دیکھیں تو ان طلبہ کی تعداد جو اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ دو تین فیصد سے زیادہ نہیں ہیں اور چھیانوے ستانوے فیصد طلبہ وہ ہیں جو دوسرے اسکولوں اور مدارس اور کالجوں میں جاتے ہیں اور دوسری طرح سے تعلیم حاصل کرتے ہیں تو ہماری اعلیٰ دینی ضرورت کے لئے کیا یہ دو تین فیصد آدمی کی ضرورت نہیں ہے؟ بہت ضرورت ہے، یہ نہیں کہ آپ سب کو اعلیٰ دینی تعلیم دیں لیکن کم از کم دو تین فیصد کو تو آپ کو دینا ہی چاہئے تاکہ آپ کی اعلیٰ علمی ضرورت اور آپ کی دینی ضرورت پوری ہو۔ ظاہر ہے کہ دو تین فیصد

کو اگر آپ دین کی اعلیٰ تعلیم دے دیں تو اس سے امت کا کام نہیں چلے گا اور وہ تعلیم جس سے دنیا کے اندر ترقی حاصل ہوتی ہے اور دنیاوی بلند مقاصد حاصل ہوتے ہیں وہ بھی بہت ضروری ہے، اس کے لئے اسکول وکالج قائم ہوتے ہیں اور وہ اسکول وکالج جو اکثریت اور حکومت کی طرف سے قائم ہوتے ہیں اس میں اسلام اور مسلمانوں کی رعایت نہیں ہوتی بلکہ عام طور پر اس سے نقصان پہونچتا ہے لیکن وہ ایک ضرورت ہے جس سے صرف نظر نہیں کر سکتے، تو انہوں نے اس کے لئے یہ انتظام کیا ہے کہ اس کے متوازی اسکول وکالج قائم کئے جس کو ہم ہندوستان میں اسلامیہ کالج اور اسکول کہتے ہیں انہوں نے اس کو مسلم اسکول اور مسلم کالج کے نام سے کھولا ہے، اس میں گورنمنٹ کا نصاب ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کی رعایت ہوتی ہے جس کی مسلمانوں کو ضرورت ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے ان علوم کو حاصل کرے، تو ایسے مسلم کالج قائم کرنے میں ان کو اس میں خرچ کرنا پڑتا ہے، وہ پرائیویٹ ہوتے ہیں لیکن وہ ساری تعلیم دیتے ہیں جو گورنمنٹ کی طرف سے دی جانی چاہئے سائنس کی اور دوسری چیزوں کی، تیسرے انہوں نے یہ انتظام کیا ہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں جو بچے اسکول وکالج جاتے ہیں جن کو روک بھی نہیں سکتے اور روکنا بھی نہیں چاہئے ان کے لئے انہوں نے ایک الگ سے اچھا انتظام کیا ہے اور ہائی اسکول تک انتظام کیا ہے جو بالکل گورنمنٹ کے اسکولوں کے متوازی ہے، اس میں کلاسوں کا نظام بھی متوازی ہے اور وہ شام کے وقت چلتے ہیں، یعنی صبح سے لے کر دوپہر تک عام طور پر وہاں اسکول وکالج اور تعلیم کے سارے مراکز چلتے ہیں، وہاں تین چار بجے سے چھ سات بجے تک یہ اسکول چلتے ہیں، اور بہت سے پڑھنے والے طلبہ یہاں آکر تعلیم حاصل کرتے ہیں، باقاعدہ داخلہ ہوتا ہے اور ان سارے مضامین کے لحاظ سے تعلیم ہوتی ہے جو وہاں اسکول وکالج میں ہوتی ہے اور یہ اضافی ہوتی ہے تاکہ ان کو ان کے دین سے وابستہ رکھا جائے اور دین کے اعتبار سے ان کو کوئی نقصان نہ ہو۔

ہم نے خود دیکھا ہے ایسے اسکولوں کو کہ طلبہ ظہر کے بعد سارے کے سارے اسی تعداد میں آتے ہیں اور یہاں کلاسیز لگ جاتے ہیں، وہ وہاں درجوں میں حاضری کے بعد یہاں کی کلاسیز میں بیٹھتے ہیں اس طرح اپنے مذہبی شعائر اور اپنی مذہبی معلومات سے ان کو واقفیت ہوتی ہے، اور چوتھا انتظام بالکل مکتب اور ابتدائی تعلیم کا انہوں نے کیا ہے، وہ اس میں عقائد اور اسلامیات کی تعلیم دیتے ہیں تو جب اس کی بنیاد مضبوط ہو جائیگی اور بنیادی طور پر جب اس کے عقائد درست ہوں گے تو اس کو زیادہ نقصان نہیں پہونچے گا، یہ انتظام انہوں نے چار قسموں کا کیا ہے اور اس میں وہ کامیاب ہیں اور وہاں جو مسلمانوں کی نسل ہے جو عام طور پر ہندوستانی اور پاکستانی ہے لیکن وہ تاجر ہیں، کاروباری ہیں، انہوں نے اپنے لڑکوں کی دینی حفاظت کے لئے یہ انتظام کیا ہے اور اس پر وہ پورا خرچ کرتے ہیں۔

> اقلیت میں ہونا بھی ایک نقص ہے لیکن اس نقص کی تلافی ہو سکتی ہے، اسکی تلافی کے ذرائع ہیں، یہ نقص ایسا ہے کہ اس کی تلافی ہو سکتی ہے،

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے لمحۂ فکریہ

ہمارا ملک اس معاملہ میں جنوبی افریقہ سے بڑی مشابہت رکھتا ہے، ہم کو بھی اس بات کی فکر کرنی چاہئے کہ ایک تو یہ کہ جو بالکل ابتدائی اور گھر سے نکل کر مکتب کی تعلیم ہے اس میں ہم اسلام کے صحیح عقائد اپنے بچوں کے دلوں اور ذہنوں میں اتار دیں اور ان کو اسلامی قدروں سے واقف کرا دیں تاکہ ان کو کوئی خطرہ پیش نہ آئے ورنہ وہ پہلے مرحلہ میں جب شرک وکفر کی باتیں سنیں گے تو وہی ان کے دلوں میں راسخ ہو جائیں گی اور یہ سمجھئے کہ زندگی بھر وہ راسخ رہیں گی، اور اس کا وبال انہیں کو نہیں ہوگا بلکہ ان کے ماں باپ کو بھی ہوگا، اور اب تو ہم دیکھتے ہیں وہ وبال صرف دینی وبال نہیں بلکہ وہ وبال اور مصیبت سیاسی طور پر بھی اور معاشی طور پر بھی اور ثقافتی طور پر ہوتی ہے، آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیا حالات ہیں کہ ہم اپنے دین کی طرف سے اگر غافل ہوتے ہیں اپنی نسل کو دین سے واقف نہیں کراتے ہیں تو ہم کو مذہبی نقصان نہیں پہونچتا بلکہ کئی جہت سے نقصان پہونچتا ہے، سیاسی میدان میں بھی ہم کو نقصان پہونچتا ہے اپنے دین سے دور ہونے کی وجہ سے اقتصادی اور اسی طرح دوسرے میدان میں بھی نقصان پہونچتا ہے۔

ہمیں بحیثیت امت کے اپنی خصوصیات کو باقی رکھنا ہے ورنہ ہم بالکل گھل کر ختم ہو جائیں گے چاہے نام وہی رکھیں اس کے علاوہ اور کوئی چیز باقی نہیں رہے گی، اور نام بھی کب تک باقی رہ سکتا ہے؟ جب کوئی دوسری چیز باقی نہیں رہے گی نام بھی ختم ہو جائے گا جیسا کہ دنیا کے کئی ملکوں میں ایسا ہو چکا ہے جو لوگ موجودہ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں انکو معلوم ہے کہ کئی ملک ایسے ہیں کہ جہاں اب نام بھی باقی نہیں رہا اور پہچاننا مشکل ہے کوئی فرق نہیں، نہ وہ فرق سمجھتے ہیں، البتہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے دادا مسلمان تھے، ایک جگہ کے متعلق ہے جہاں اس وقت مسلمان اکثریت میں ہیں لیکن ایک صاحب نے کسی جاننے والے سے کہا کہ ہم مذہبی آدمی ہیں، کہا کہ اچھا آپ مذہبی آدمی ہیں؟ یعنی وہ بتا رہے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان جیسا ہوتا ہے ہم ویسا کرتے ہیں، تو انہوں نے پوچھا کیسے؟ وہ کہنے لگے کہ جب ہم صبح کو اٹھتے ہیں تو فلاں دعا پڑھ لیتے ہیں، دو چار عربی کے الفاظ تھے وہ انہوں نے بتایا کہ ہم پڑھ لیتے ہیں ان کو اس کے علاوہ کچھ

اب ہمارے بچے کی تربیت کون کرتا ہے؟ ٹیلی ویژن کرتا ہے اور بچہ ذرا بڑا ہوجاتا ہے تو اخبارات ورسائل کرتے ہیں اور یہ بتانے کی ضرورت ہے ہی نہیں کہ ٹیلی ویژن کیا سکھاتا ہے؟

بھی معلوم نہیں تھا کہ اسلام کیا ہے؟ دو تین چار عربی کے الفاظ ان کو کسی نے بتادیے تھے وہ ان کو صبح کے وقت پڑھ لیا کرتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں، نام بھی مسلمان کا نہیں، اعمال بھی مسلمان کے نہیں، تو یہ تو فطری نتیجہ ہے اگر ہم نے احساس نہیں کیا اپنے نقص کا کہ ہم بہر حال اقلیت میں ہیں، اقلیت میں ہونا بھی ایک نقص ہے لیکن اس نقص کی تلافی ہوسکتی ہے، اسکی تلافی کے ذرائع ہیں، یہ نقص ایسا ہے کہ اس کی تلافی ہوسکتی ہے، ہم کو اس بات کی فکر کرنی ہے کہ تعلیم کے معاملہ میں ہمیں وہ ساری اقسام اختیار کرنی پڑیں گی جن کا ہم نے آپ کے سامنے ذکر کیا، اس لئے کہ جدید تعلیم جس کے بغیر ہم دوسری قوموں اور دوسرے ہمسروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں وہ لازمی اور ضروری ہے لیکن اس کو حاصل کرنے میں ہم کو جو دینی نقصان ہوسکتا ہو اس کی بھی فکر کرنی ہوگی اور اس کی تلافی کرنی ہوگی، اس کے لئے الگ سے انتظام کرنا ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ مکتب کی تعلیم میں ہمیں اس کی زیادہ رعایت کرنی ہوگی کہ ہمارا بچہ شروع سے دین سے ناواقف نہ ہو اس لئے کہ شروع سے اگر اس کے دماغ میں مشرکانہ عقائد بٹھادیے جائیں یا مشرکانہ قدریں اس کے ذہن میں اتار دی گئیں تو آسانی سے انہیں نکال نہیں سکتے، ہمیں اپنے گھر کے ماحول اور گھر کے جو انتظامات ہوتے ہیں ان میں بھی اس کی فکر کرنی ہوگی اور مکتب کی تعلیم جیسے پہلے اسکا ایک انتظام تھا اور اب اس کا انتظام دوسری شکل میں ہوسکتا ہے، پہلے یہ تھا کہ بچہ جب گھر سے باہر نکل سکتا تھا تو مسجد میں باہر کے مولوی سے الف با اور پارہ عم وغیرہ پڑھ لیا کرتا تھا اور کچھ دینی قدریں اور دینی عقائد ہیں وہ جاکر مسجد میں مولوی صاحب سے سیکھ لیا کرتا تھا اور پھر اس کی تعلیم شروع ہوتی تھی، اب یہ سب ختم ہوگیا، اب ہمارے بچے کی تربیت کون کرتا ہے؟ ٹیلی ویژن کرتا ہے اور بچہ ذرا بڑا ہوجاتا ہے تو اخبارات ورسائل کرتے ہیں اور یہ بتانے کی ضرورت ہے ہی نہیں کہ ٹیلی ویژن کیا سکھاتا ہے؟ اور آج کل ہم لوگ جو یہ سوچتے ہیں کہ ہمارا بچہ ہماری طرح ہوگا تو ایسا ممکن نہیں، یہ نہیں کہ وہ کوئی معدنی چیز ہے کہ جیسے کان سے نکلا ویسے ہی رہے گا، یہ انسان ہے، انسان پر تربیت

"میں اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہوتا تھا اور ماں قرآن مجید کی تلاوت کرتی تھیں مجھے ان کی تلاوت اچھی لگتی تھی اور وہ چیز میرے دل میں ابھی تک موجود ہے اور اسی نے مجھ کو آمادہ کیا کہ قرآن مجید کی بلاغت اور اس کے اعجاز پر کتاب لکھوں"

و تعلیم کا بہت اثر پڑتا ہے جس ماحول میں اور جس طریقہ تعلیم میں اور جن مقاصد کے ساتھ اس کو سکھایا پڑھایا جائے وہی اس کو آئے گا جتنا اس سے کام نہیں چلے گا، ہمارا بچہ ہمارے جیسا کیا ہمارا مخالف بھی ہوسکتا ہے ہمارا برعکس ہوسکتا ہے کہ بعد میں اسکو دیکھ کر سوائے کڑھن کے اور سوائے افسوس کے اور کچھ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا اس کا خطرہ ہے اگر ہم نے شروع سے انتظام نہیں کیا، اور انتظام کا مطلب میرا یہ نہیں ہے کہ دینی تعلیم دیدی جائے، نہیں، بلکہ جو کمی اور نقصان ہوسکتا ہے عصری اور جدید تعلیم سے، ظاہر ہے کہ وہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے، وہ تو اکثریت کے اختیار میں ہے، اس میں ہم کچھ نہیں کرسکتے، ہم صرف یہی کرسکتے ہیں کہ اس سے جو نقصان ہوسکتا ہے اس نقصان کی ہم فکر کریں اور اسکی تلافی کے انتظامات کریں اور یہ بغیر احساس کے نہیں ہوسکتا ہے، احساس کی بڑی ضرورت ہے، ہم سمجھیں اپنی پوزیشن کو، اپنی کمی کو اور اپنے مستقبل کو بھی سوچیں کہ مستقبل میں کیا ہونے جارہا ہے اور پھر اس کے مطابق ہم فکر کریں تو انشاء اللہ ہم اس پوزیشن میں ہوں گے کہ دوسروں سے مقابلہ کرسکتے ہیں اور ہم دوسروں سے پیچھے نہیں رہیں گے بلکہ ہم دوسروں سے بہتر رہیں گے، اسلئے کہ ہماری جو قدریں ہیں وہ بڑی اعلیٰ ہیں وہ انسانیت کو بھی فروغ دیتی ہیں اور اسکے ساتھ ساتھ وہ صلاحیتیں پیدا کرتی ہیں جو دوسری قدروں سے پیدا نہیں ہوتیں، اس میں ایثار پیدا ہوتا ہے، اس میں اپنے پروردگار کی مرضی کے مطابق محنت اور جدوجہد کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس میں خودغرضی نہیں رہتی، اس میں انسانیت نوازی ہوتی ہے، دوسری قدروں میں یہ چیزیں نہیں ہوتی ہیں،

بچپن کا نقش، نقش کالحجر ہوتا ہے

تو جب ہم کسی مدرسہ یا کسی اسلامی اسکول کو دیکھتے ہیں تو یہ باتیں ہمارے ذہن میں آتی ہیں اور ہم اس اسکول ومدرسہ کی بہت قدردانی کا اظہار کرتے ہیں، اسلئے کہ وہ ایک بیج ہے، اس سے ایک تناور درخت پیدا ہوسکتا ہے، بعض وقت ایک چھوٹی سی چیز انسان کو کہیں سے کہیں پہونچادیتی ہے، مصر کے ایک بڑے ادیب ہیں جن کا ادب میں طوطی بولتا تھا، دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، ادب پر کتابیں لکھتے تھے، ادب پر لکچر دیا کرتے تھے اور ادب ہی کی تعلیم دیتے تھے، اور آپ جانتے ہیں کہ ادیب کا دیندار ہونا ضروری نہیں ہوتا، انہوں نے قرآن کے اعجاز پر ایک کتاب لکھی، لوگوں کو تعجب ہوا کہ ان کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا پھر انہوں نے یہ کتاب کیسے لکھی؟ جب اس کا مقدمہ میں نے پڑھا اس میں لکھا تھا کہ میں اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہوتا تھا اور ماں قرآن مجید کی تلاوت کرتی تھیں مجھے ان کی تلاوت اچھی لگتی تھی اور وہ چیز میرے دل میں ابھی تک موجود ہے اور اسی نے مجھ کو آمادہ کیا کہ قرآن مجید کی بلاغت اور اس کے اعجاز پر کتاب لکھوں، آپ سوچئے کہ

آپ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر لوگ جب دوائیں دیتے ہیں اور یہ سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر لوگ جو دوائیں دیتے ہیں ان سے سائڈ ایفکٹ بھی ہوتا ہے تو اسکو دور کرنے کیلئے بھی دوائیں دیتے ہیں تو ہمیں بھی یہی کرنا پڑے گا کہ جو تعلیم کا نظام ہے اس سے ہم بچ نہیں سکتے لیکن ہمیں سائڈ ایفکٹ (Side Effect) سے اپنے بچوں کو بچانا ہوگا

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ٹیلی ویژن پر جو کچھ دکھایا اور بتایا جاتا ہے وہ ہوا میں تحلیل ہوجاتا ہے، نہیں، بلکہ وہ اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے

کس زمانہ کی بات ہے؟ جب وہ نہ بول سکتے ہونگے، ماں کی گود میں ہونے کا کیا مطلب ہے، لیکن وہ جو بیج پڑ گیا تھا، تناور درخت بن گیا پھر وہ مجاہد اور بڑے دیندار ہوئے اور انہوں نے اپنی زندگی دین کے لئے صرف کردی اور یہ سب کچھ ان کی کتاب کے اس مقدمہ سے پتہ چلا، تو آپ اسکو معمولی نہ سمجھئے، گھر کے اندر آپ بچے کے دل میں جو بیج ڈال دیں گے اور پھر مکتب میں اسکو جو سکھادیں گے وہ زندگی بھر اس کا ساتھ دے گا، اس کو معمولی چیز مت سمجھئے، لیکن ضرورت احساس کی ہے کہ ہم سمجھیں کہ ہم کس پوزیشن میں ہیں، اگر ہم اس پوزیشن پر راضی رہے اور ہم نے کچھ کرنے کی کوشش نہیں کی تو مستقبل کی بات یہ ہے کہ وہ بڑا ظالم ہوسکتا ہے وہ بالکل مروت نہیں کرے گا، جس راستہ سے آدمی گذرے گا اس راستہ کے اثرات اس پر پڑیں گے ہماری تمنا سے نہیں ہوگا، ہم چاہیں کہ ہمارا بچہ یہ ہوجائے وہ ہوجائے، اس سے نہیں ہوگا، ایسا کرنے کے لئے ہمیں انتظامات کرنے ہوں گے، جتنا آپ چاہیں کہ ہمارا بچہ بڑا انجینئر ہوجائے تو آپ کو ویسی ہی تعلیم پڑھانی پڑے گی اور ویسی ہی اس کو اعلیٰ تعلیم دینی ہوگی جب ہی وہ انجینئر بنے گا، آپ کی تمنا سے نہیں بنے گا، آپ چاہیں کہ آپ کا بچہ نیک اور صالح بنے اس کے لئے آپ کو اسکا انتظام کرنا ہوگا، لیکن یہ انتظام کب ہوگا جب ہم کو احساس ہو کہ ہم کس پوزیشن میں ہیں؟ اور اس پوزیشن سے ہم اپنے کو کس طرح بہتر بنا سکتے ہیں؟ اس کے جو طریقے ہیں اور لوگوں نے جو تجربے کئے ہیں ان تجربوں سے فائدہ اٹھا کر ہوسکتا ہے، تو ان مکاتب ومدارس کو بھی آپ کمتر نہ سمجھئے، ان کو سمجھئے کہ یہ ایک ضرورت پوری کررہے ہیں کل ضرورت پوری نہیں کررہے ہیں یہ سب جانتے ہیں، لیکن ایک ضرورت پوری کررہے ہیں، اور ان کا ایک کردار ہوگا اور یہ امت کو فائدہ پہونچائیں گے لیکن عام تعلیم کے اندر ایک مسلمان کی حیثیت سے جو کمی رہ سکتی ہے اسکی تلافی آپ کو کرنی ہوگی، اس کے لئے انتظام کرنا ہوگا، چاہے آپ اصل میں نہیں کرسکتے ہیں تو اس کے ایک پہلو کے لحاظ سے آپ کریں گے، اسلئے کہ اس وقت ہمارے ہاتھ پاؤں گویا کٹے ہوئے ہیں، ہمارے گھروں میں جو تربیت ہورہی ہے وہ ہماری مرضی کے خلاف ہورہی ہے ٹیلی ویژن سے جو تربیت ہوگی اور ہورہی ہے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ٹیلی ویژن پر جو کچھ دکھایا اور بتایا جاتا ہے وہ ہوا میں تحلیل ہوجاتا ہے، نہیں، بلکہ وہ اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے اور بچوں کے اوپر تو بہت زیادہ نقش چھوڑتا ہے اسلئے کہ اس کا دل کھلا ہوا ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جو نئی ہوگی اور اس کو ملے گی اس کو وہ قبول کرے گا، ہم اگر اسکو روک نہیں سکتے ہیں تو اسکے علاج کے طور پر ہمیں ایک چیز اختیار کرنی پڑیگی، آپ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر لوگ جب دوائیں دیتے ہیں اور یہ سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر لوگ جو دوائیں دیتے ہیں ان سے سائڈ ایفکٹ بھی ہوتا ہے تو اسکو دور کرنے کیلئے بھی دوائیں دیتے ہیں تو ہمیں بھی یہی کرنا پڑے گا کہ جو تعلیم کا نظام ہے اس سے ہم بچ نہیں سکتے لیکن ہمیں سائڈ ایفکٹ (Side Effect) سے اپنے بچوں کو بچانا ہوگا لیکن یہ کب ہوگا جب ہمیں اپنی ضرورت کا احساس ہو تو تعلیم کے سلسلہ میں جو انتظام ہو چاہے مدرسہ ہو، چاہے مکتب ہو چاہے اسکول ہو جس میں اسلام اور مسلمانوں کی رعایت ہوتی ہو ان تمام کی قدر کرنے کی ضرورت ہے اور تعاون کرنے کی ضرورت ہے، بس انہیں الفاظ پر اکتفا کرتا ہوں اور اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہوں کہ مدرسہ قائم ہوا ہے، انشاء اللہ اس سے بہتر نتائج پیدا ہوں گے۔

● ● ● ●

عالمی رابطہ ادب اسلامی

رفتار کار

ابن فرید کی نگارشات سماجی مسائل کی صاف ستھری عکاسی اور گرہ کشائی میں بے مثال

(رابطۂ ادب اسلامی دہلی کے جلسے میں اہل علم کی رائے)

''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق استاذ ماہنامہ حجاب (رامپور) کے مدیر اعلیٰ، ڈاکٹر ابن فرید (۱۹۲۵ء-۲۰۰۲ء) جو سماجیات اور نفسیات کے فاضل، انگریزی و اردو زبان کے قلم کار و انشاء پرداز تھے، اپنی تحریروں کے دم پر زندۂ جاوید رہیں گے، ان کی تصانیف سماجی مسائل کی صاف ستھری عکاسی، بے راہ روی کی نباضی اور عقدہ ہائے پر پیچ کی گرہ کشائی میں بے مثال اور منفرد ہیں۔''

ان خیالات کا اظہار یہاں رابطۂ ادب اسلامی کے اس ادبی جلسے میں کیا گیا، جو اس کے ہندوستانی دفتر میں بمقام مصطفیٰ منزل، نمونہ پارک اوکھلا، جامعہ نگر نئی دہلی میں منعقد ہوا، صدر رابطہ پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی نے استقبالیہ کلمات کے طور پر بین العلومی ادیب و ناقد ڈاکٹر ابن فرید کے عمومی کارنامے گناتے ہوئے ان کی غیر مطبوعہ تصانیف کی طباعت پر زور دیا، ناظم اجتماع پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی نے ان کی مطبوعہ تصانیف: چہرہ پس چہرہ ہم اور ادب، نیرنگ ادب، ادب داد طلب، چھوٹی بہو، بچے کی تربیت، یہ جہاں اور ہے اور خون آشام کا تعارف کرایا، ڈاکٹر عبدالباری شبنم سبحانی نے ڈاکٹر ابن فرید سے اپنے دیرینہ تعلق اور ادب اسلامی سے متعلق ان کی خدمات پر روشنی ڈالی، انہوں نے بتایا کہ ان کے غیر مطبوعہ مسودات ان کے پاس موجود ہیں انشاء اللہ جلد ہی زیور طبع سے آراستہ ہو کر ۵ کتابوں کی شکل میں منظر عام پر آنے والے ہیں، انہوں نے کہا کہ اخلاص پیہم، جہد مسلسل اور فرد و سماج کی پاکیزہ اخلاقی تعمیر کی لگن میں ان کی پوری زندگی ہمارے لیے ایک مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر تابش مہدی نے ''ابن فرید کی تنقید: ایک مطالعہ'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا، موصوف نے بڑی تفصیل کے ساتھ ڈاکٹر ابن فرید کی کتابوں: چہرہ پس چہرہ، ہم اور ادب، ادب داد طلب اور نیرنگ ادب کے حوالے سے ان کی تنقیدی دریافتوں اور ادبی بصیرتوں کو اجاگر کیا اور بتایا کہ ڈاکٹر ابن فرید ہمارے ان ناقدوں میں ہیں جن کا اعتراف ہر حلقۂ فکر میں ہوا، مقالہ نگار نے اس بات پر خصوصی زور دیا کہ اسلامی نظریۂ ادب سے تعلق رکھنے والوں میں ابن فرید کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ ان کی ادبی تنقیدی آراء کو لوگوں نے بھی اہمیت دی جنہیں ان کے نظریہ سے اتفاق ہے اور ان لوگوں نے بھی جو ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔

مقالے کے بعد شعر و سخن کا دور چلا، جس میں صدر نشیں حضرت ابو المجاہد زاہد کے علاوہ، تابش مہدی، رضوان اللہ فاروقی، ریاض جونپوری اور تنویر آفاقی نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا، جلسے کا افتتاح ڈاکٹر نسیم اختر ندوی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا، جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور دوسرے تعلیمی و علمی حلقوں سے تعلق رکھنے والے ارباب ذوق کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی۔ ☆☆☆

رابطہ ادب اسلامی (بھٹکل) کا سیمینار

۷ راگست۔ بروز جمعرات جامعہ اسلامیہ بھٹکل کے وسیع و خوبصورت کانفرنس ہال میں مولانا ابو الحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی بھٹکل کے زیر اہتمام رابطہ ادب اسلامی بھٹکل شاخ کی طرف سے اہل نوائط کی ادبی و علمی شخصیات پر شاندار سمینار منعقد ہوا، جس کی صدارت مولانا عبدالعلیم صاحب قاسمی ناظم جامعۃ الصالحات نے فرمائی، پہلی نشست میں کل آٹھ مقالات پیش کیے گئے۔

دوسری نشست کی صدارت ناظم جامعہ نے فرمائی جس کے شروع میں رابطہ ادب اسلامی اور مولانا ابو الحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی کے جنرل سکریٹری مولانا الیاس صاحب ندوی نے رابطہ ادب اسلامی کی سالانہ رپورٹ پیش کی، اس میں انہوں نے بتایا کہ رابطہ کی بھٹکل شاخ کا قیام ۱۹۹۸ء میں مفکر اسلام کی موجودگی میں عمل میں آیا تھا، اس کے تحت اب تک ایک کل ہند اور پانچ مقامی سمینار ہو چکے ہیں، اس نشست میں کل چھ مقالات پیش کیے گئے، ان دونوں نشستوں میں چند ایسی ہستیوں کا ذکر ہوا جس سے عوام ناواقف تھے، ان میں خاص کر محمد حسین ازہری چامنڈی بھٹکلی جنہوں نے ۲۲ سال تک جامعہ ازہر مصر میں تدریسی فرائض انجام دیے، مولانا عبدالمتین منیری نے بھٹکل کے نوائط پر ایک تاریخی مقالہ پیش کیا اور اخیر میں صدر جلسہ نے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ اس طرح کے سمینار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے ذریعہ اپنے اسلاف کو اور ان کے کارناموں کو یاد کریں اور اس پر چلنے کی کوشش کریں،

بھٹکل میں مولانا ابوالحسن ندوی اکیڈمی کا جلسہ تقسیم انعامات

۱۰ راگست بروز اتوار بعد نماز عصر ملیہ نوائط کالونی کے احاطہ میں مولانا ابوالحسن ندوی اسلامک اکیڈمی

بقیہ: صفحہ ۱۶ پر

عقیدۂ رسالت

مولانا بلال عبدالحی حسنی

کوئی امتی ایسا بد بخت ہو سکتا ہے جو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے منہ پھیرے، جس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان ہے وہ محبت رسول کا اقرار کرتا ہے، لیکن ایمان کے لئے صرف زبانی اقرار کافی نہیں، بلکہ یہ دل کی ترجمانی ہونی چاہئے کہ یہ عقیدہ کا ایک حصہ ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا یؤمن احدکم أکون أحب إلیه من والده وولده والناس أجمعین

''تم میں کوئی بھی اس وقت تک ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کو اس کے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں''

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہر محبت اور چاہت پر غالب ہو، اور اس کی کسوٹی یہ ہے کہ محبت رسول کا کسی دوسری محبت یا خواہش سے تقابل آپڑے تو مومن کا دل محبت رسولؐ سے سرشار رہے، ایک طرف نفس کے تقاضے ہوں والدین اور بیوی بچوں کی محبت سامنے ہو، لیکن ان میں سے کوئی چیز محبت رسول کے سامنے ٹک نہ سکے، اور یہ چیز اس کے عقیدہ میں شامل ہو کہ اللہ جل شانہ کے بعد اس کے لئے سب سے محبوب ذات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، اگر کوئی مسلمان آپ کی محبت ضروری نہیں سمجھتا تو اس کا ایمان خطرہ میں ہے۔

اس عقیدہ کے ساتھ دوسرا عقیدہ عظمت کا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر نہ پہلے کوئی پیدا ہوا اور نہ آئندہ کوئی وجود میں آسکتا ہے، بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''أنا سید ولد آدم ولا فخر'' ''میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں، اور یہ کوئی اظہار فخر نہیں (بلکہ اظہار حقیقت ہے)

احترام و عقیدت کے جذبات دل سے امنڈ نے چاہئیں، اور شان اقدس میں کبھی بھی ایسی بات نہ دل میں آئے اور نہ زبان پر جاری ہو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و تقدیس سے میل نہ کھاتی ہو، اللہ تعالیٰ نے امت کو یہاں تک حکم فرمایا کہ اپنی آواز حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز مبارک سے بلند نہ ہونے پائے، ورنہ بڑی سے بڑی نیکی بھی کام آنے والی نہیں ارشاد ہوا:

لا ترفعوا أصواتکم فوق صوت النبی ولا تجهروا له بالقول کجهر بعضکم أن تحبط أعمالکم وأنتم لا تشعرون (الحجرات/۴۹)

''اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر بلند نہ کرو اور آپ کو بلند آواز سے نہ پکارو جب کہ ایک دوسرے کو بلند آواز سے پکارتے ہو کہ تمہارے اعمال سوخت ہو جائیں اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے''

عقیدہ رسالت کی تیسری اہم کڑی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو واجب الاطاعت سمجھے، آپ جو فرمادیں وہ حرف آخر ہے، اس کے بعد چوں چرا کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، اگر کسی کے دل میں یہ بات آئی کی بلاشبہ آپ نبی تو ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات ماننا ضروری نہیں ہے تو اس کا ایمان باقی نہیں رہا، قرآن مجید میں بار بار یہ حکم ہے ''أطیعوا الرسول'' رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو،

عقیدہ رسالت کے سلسلہ کی یہ تین باتیں ایسی ہیں جو عقیدہ میں بھی داخل ہیں اور عمل میں بھی، ہمارا عقیدہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کوئی محبوب نہیں، آپ کے برابر کوئی احترام و عقیدت کے لائق نہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی واجب الاطاعت نہیں، پھر اس کے مطابق ہمارا عمل بھی ہونا چاہئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ایسی رچ بس جائے جو صحابہ کے دلوں میں تھی، اپنی جان نچھاور کرنے والے، دل و جان سے قربان ہونے والے، ایک اشارے پر مر مٹنے کے لئے تیار، دشمن بھی یہ گواہی دے رہا ہے کہ ''میں نے قیصر و کسریٰ کے دربار دیکھے، بادشاہوں کے یہاں گیا دنیا دیکھی، مگر جیسا اصحاب محمد کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت کرتے دیکھا کہیں نہیں پایا''۔

جس طرح محبت و عظمت کے باب میں صحابہ کرام پوری امت کے لئے اسوہ ہیں اسی طرح اتباع نبی میں بھی ان سے بڑھ کر کوئی نہیں، عقیدہ ان کے دل و دماغ میں سرایت کر گیا تھا۔

شراب کا عام رواج تھا اور کتنے لوگ اس کے رسیا تھے لیکن جس لمحہ شراب کی حرمت کا اعلان ہوا لبالب جام منہ سے ہٹا دیئے گئے، اور لوگوں نے دیکھا کہ مدینہ کی گلیوں میں شراب بہ رہی تھی،۔

محبت رسول، عظمت رسول، اطاعت رسول، ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کی یہ تین اہم بنیادیں ہیں ان کے علاوہ تین وہ بنیادی عقائد ہیں کہ جن سے مومن کو مفر نہیں، ایک عقیدہ ختم رسالت ہے دوسرا عقیدہ عصمت اور تیسرا عقیدہ بشریت ہے۔

خود قرآن مجید کا صاف اعلان ہے ''ما کان محمد أبا أحد من رجالکم ولکن رسول الله وخاتم النبیین'' ''(محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم میں سے کسی مرد کے والد نہیں، وہ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعلان فرمایا ''أنا خاتم النبیین لا نبی بعدی'' (میں آخری نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد جس نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا وہ کذاب اور دجال ہے، وہ مسیلمہ کذاب ہو اسود عنسی ہو یا بعد کے آنے والے مدعیان نبوت ہوں، نہ کوئی ظلی نبی ہے نہ بروزی، نہ حقیقی ہے نہ تاویلی، قریبی زمانہ میں غلام احمد قادیانی نے امت کو فریب میں ڈال کر اپنے سیکڑوں متبعین پیدا کر لئے اور آج بھی اس کذاب کے ماننے والے سیدھے سادھے مسلمانوں کو مختلف طریقوں پر دھوکہ دے رہے ہیں، تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ایسے دھوکہ بازوں سے ہوشیار رہیں جو ایمان پر ڈاکہ ڈالنے والے ہیں۔

عقیدہ ختم نبوت عقیدۂ رسالت کی بنیاد ہے اس میں اگر رخنہ پڑا تو ایمان کی عمارت منہدم ہو جائے گی۔

دوسرا عقیدہ عصمت انبیاء کا ہے، نبی کو ہر گناہ سے معصوم سمجھنا عقیدہ رسالت کا اہم حصہ ہے، اگر کوئی نبی کو گنہگار سمجھتا ہے تو اس کا ایمان بھی خطرہ میں ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہر پیدا ہونے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ پیدا فرماتے ہیں جو اس کو بھلائی پر آمادہ کرتا ہے اور ایک شیطان پیدا فرماتے ہیں جو اس کو برائی کی دعوت دیتا رہتا ہے، پھر فرمایا "ولکن اللہ اعانی علیہ فاسلم "میرے شیطان پر اللہ نے میری مدد فرمائی تو میں اس سے محفوظ ہو گیا، بعد روایتوں میں اس کو "اسلم" پڑھا گیا یعنی وہ میرا تابع فرمان بن گیا۔

نبی اپنی امت کے لئے نمونہ ہوتا ہے اس کی مطلق تقلید و اتباع امت کے لئے ضروری ہے، اگر امت کے دل میں اس کی عصمت کا عقیدہ نہ ہو تو امت کس طرح نبی کے اتباع کامل اور مطلق تقلید کو ضروری سمجھ سکتی ہے، جن قوموں نے بھی انبیاء کی عصمت کا عقیدہ نہیں رکھا اور ان کی طرف ایسی رکیک باتیں منسوب کیں جو نفوس قدسیہ کے لئے ایک دھبہ کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ قومیں بھٹکیں اور بھٹکتی چلی گئیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی تحریر فرماتے ہیں

"انبیاء کا خطا سے معصوم ہونا اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے ضروری علم و یقین کی وجہ سے ہوتا ہے جس کے سبب نبی سمجھتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے جو چیز پا رہا ہے اور سمجھ رہا ہے وہ حقیقت کے عین مطابق ہے اور اسے ایسا یقین ہوتا ہے گویا کوئی حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے"۔

مزید فرماتے ہیں:

"اور لوگوں کو انکی عصمت کا یقین نبی کی عقلی اور خطابی دلیلوں سے ہوتا ہے، کہ اس کی دعوت ایسی صحیح اور انکی سیرت ایسی صالح ہے جہاں کذب کا گذر نہیں اور کبھی اس کے خدا کے قریب ہونے کا بھی مشاہدہ انہیں معجزات اور اس کی دعاؤں کی مقبولیت سے ہو جاتا ہے، یہ اس لئے ہوتا ہے تا کہ انھیں نبی کی عظیم دعوت کی عظمت کا احساس ہو جائے اور وہ یہ جان لیں کہ وہ ملائکہ سے رابطہ رکھنے والے نفوس قدسیہ میں سے ہیں"۔

عصمت کے ساتھ اسلام انبیاء کی بشریت کا قائل ہے اور یہ اسلامی عقیدہ کا ایک اہم اور ضروری جز ہے۔

انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ اپنے لئے نمونہ (Ideal) تلاش کرتا ہے، اس کے لئے صرف افکار و نظریات کافی نہیں ہوئے، بلکہ ان افکار و نظریات کی حامل ایک مثالی شخصیت بھی اس کے لئے ضروری ہے، جس کو دیکھ کر وہ نقل اتار سکے، اور یہ بات بھی اس کے نہاں خانہ دل میں پیوست ہے کہ نقل اسی کی کی جا سکتی ہے جو اس جیسا انسان ہو، اگر وہ مافوق البشر کوئی ہستی ہے وہ تو یقیناً اس کے پاس وہ طاقت بھی ہوگی، جس کی وجہ سے وہ بہت سے ایسے کام کر سکتا ہے جو انسان نہیں کر سکتا، ایسی شکل میں ایک انسان اس کی نقل کیسے کر سکتا ہے، یہ وہ تصور ہے جو انسان اپنے آئیڈیل کے لئے قائم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام انسانوں ہی پیدا فرمائے، وہ انسانوں میں افضل ترین تو ہیں لیکن مافوق البشر ہستیاں نہیں ہیں، تا کہ انسانوں کو ان کی نقل کرنے میں اور اتباع کرنے میں کسی بھی قسم کی عقلی یا عملی رکاوٹ نہ ہو، آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے اللہ جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں "قل إنما أنا بشر مثلكم يوحىٰ إليّ إنما إلٰهكم إله واحد" (آپ فرما دیجئے کہ میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں (فرق یہ ہے کہ) مجھ پر وحی آتی ہے، تمہارا معبود تو صرف ایک معبود ہے)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد صحیح احادیث میں صاف صاف یہ اعلان فرمایا ہے، "إنما أنا بشر مثلكم"، میں تمہاری طرح انسان ہوں، جس طرح یہ ایک حقیقت کا اعلان ہے اسی طرح یہ انسانیت کی معراج بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان بنایا گیا ہے اور دوسرے انسانوں کے لئے آپ کی اتباع بھی آسان ہو جاتی ہے۔

ہر امتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں ان چھ باتوں کو خاص طور پر دھیان میں رکھے، آپ کی محبت عظمت و اطاعت کا عقیدہ اور اس کے مطابق عمل، ختم رسالت، عصمت اور بشریت کا ایسا پختہ عقیدہ کہ اس میں ذرا بھی انحراف نہ ہو۔ ✶ ✶

بقیہ: بھٹکل میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اکیڈمی......

بھٹکل کے زیر اہتمام ہائی اسکولوں و کالجس کے مسلم طلباء کیلئے اوپن اسلامک دینی کورس کا تقسیم انعامات کا دوسرا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، جلسہ کی صدارت ناظم جامعہ نے فرمائی، اپنی رپورٹ میں مولانا الیاس ندوی نے بتایا کہ اکیڈمی کے تحت علماء کے لئے ان کو دعوتی میدان میں زیادہ کارآمد بنانے کے لئے بنیادی عصری علوم کے کلاس، غیر مسلم نوجوانوں کے لئے تعارف اسلام کے کورس و اسلامی معلومات پر مشتمل کنڑی ویب سائٹ اور ہائی اسکول و کالجس میں زیر تعلیم مسلم طلباء کے لئے آٹھ سالہ اوپن اسلامک دینی کورس شروع کئے گئے ہیں جس کا یہ دوسرا سال ہے، اس کے تحت کرناٹک کے مختلف اضلاع بنگلور، میسور، ٹمکور، ہاسن، کولار، گلبرگہ، شیموگہ اور منگلور وغیرہ میں ۲۸ سینٹرس قائم ہیں، جہاں سے امسال الحمدللہ سولہ سو سے زائد طلباء نے داخلہ لیا ہے، ان امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طلباء کے درمیان تقسیم انعامات کا یہ دوسرا سالانہ جلسہ ہے، مولانا نے امید ظاہر کی کہ انشاء اللہ اگلے سال اکیڈمی جامعہ آباد روڈ پر واقع اپنی خود کی وسیع زمین پر منتقل ہو جائے گی، اس جلسہ میں چار نئی کتابوں کا اجراء بھی ہوا، پہلی کتاب مولانا فیصل ندوی کی جو برصغیر کی آزادی میں علماء کے کردار پر تھی، اس کے بعد مولانا محمد الیاس ندوی کی نئی شائع شدہ کتاب "اسلام: مشرق و مغرب میں...." تیسری و چوتھی کتاب مفکر اسلام علیہ الرحمہ کی قصص النبیین چار جلدیں اور اسلام ایک تعارف کنڑی ترجمہ تھی، رکن اکیڈمی محتشم عبدالغنی صاحب، مولانا فرید الدین صاحب عمری مدنی اور صدر جلسہ نے بھی حاضرین سے خطاب کیا (اطہر وکلی)

☆☆☆

قرآن حکیم اور موجودہ نظام شمسی

پروفیسر قمر اللہ خاں، گورکھپور

مشہور سائنسداں Bertrand Russell ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ کس طرح زمین، سورج کے چاروں طرف اپنے محور پر گردش کرتی ہوئی گامزن ہے اور کس طرح سورج ہماری Galaxy (جو بیشمار ستاروں پر مشتمل ہے) کے مرکز کے چاروں طرف ایک مدار پر سفر کر رہی ہے، تقریر کے اختتام پر ایک بڑھیا نے ہال کے پچھلے حصے سے کھڑی ہو کر کہا "کہ جو کچھ تم نے بتایا، وہ سب بکواس ہے۔ زمین ایک چپٹی (Flat) پلیٹ (Disc) کی طرح ہے جو ایک دیو ہیکل کچھوے کی پیٹھ پر ٹکی ہوئی ہے۔" سائنسداں نے ایک فوقی تبسم کے ساتھ سوال کیا، "وہ کیا ہے جس پر کچھوا ٹکا ہوا ہے؟" بڑھیا نے جواب دیا، "تم بہت ہی ہوشیار ہو نوجوان" اور پھر کہا۔ "تو سن لو! کچھوے کے نیچے پھر کچھوا ہے اور یہ سلسلہ نیچے کی طرف آخری حد تک برقرار ہے۔"

زیادہ تر لوگ کائنات کی تصویر کو کچھوؤں کے ایک لامتناہ اونچے مینار کی شکل میں تصور کرنا ایک مذاق سمجھیں گے۔ لیکن آخر کیوں ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہم زیادہ جانکار ہیں؟ ہم کائنات کے بارے میں کیا جانتے ہیں اور کیوں جانتے ہیں؟ کہاں سے یہ کائنات ظہور میں آئی اور کہاں جا رہی ہے؟ کیا کائنات کی کوئی ابتدا تھی، اور اگر تھی تو اس سے قبل کیا ہوا؟ وقت کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ کبھی ختم ہو جائے گا؟ طبیعات کے حالیہ انکشافات، جو حیرت انگیز جدید تکنیکی ترقی سے ممکن ہو سکے ہیں مندرجہ بالا سوالات میں سے کچھ کا جواب دینے کے لائق ہو گئے ہیں اور کسی نہ کسی دن یہ جوابات ہمارے لئے اس طرح قابل یقین ہو سکتے ہیں جیسے سورج کے گرد زمین کی گردش، یا پھر بڑھیا کے کچھوؤں کے مینار کی طرح احمقانہ، یہ صرف وقت (جو بھی اس کی حقیقت ہو) بتائے گا۔

340 B.C. میں ارسطو نے اپنی کتاب On the Heavens میں زمین کے کروی (Spherical) نہ کہ ایک چپٹی Disc ہونے کے دو دلائل دئے، پہلی یہ کہ خسوف (چاند گرہن) کے واقع ہونے کی وجہ زمین کا سورج اور چاند کے بیچ حائل ہونا ہے۔ اور خسوف کے اوقات میں چاند پر زمین کا پرتو

> راقم الحروف کا ذاتی خیال ہے کہ تمام علمی تصانیف کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ یقیناً لاطینی زبان میں ہوا ہوگا، جس سے مغربی محققین نے قرآن کی علمی اور خاص طور پر طبی اور فلکیاتی آیتوں سے ضرور استفادہ کیا ہوگا جس کے کچھ ثبوت مندرجہ ذیل تحریر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

ہمیشہ خمیدہ ہوتا ہے جو اسی وقت ممکن ہے جب زمین کروی ہو۔ دوسری طرف یونانیوں کی دلیل یہ تھی کہ سمندری جہاز جب اپنے راستے کے نقطۂ انتہا کو پہنچتا ہے تو نظروں سے اوجھل ہوتے وقت پہلے ڈھانچہ اوجھل ہوتا ہے پھر اس کا بادبان۔

بہر حال ارسطو کا نظریہ تھا کہ زمین ساکت ہے اور سورج، چاند، سیارے اور ستارے زمین کے چاروں طرف دائراتی مدار پر گھوم رہے ہیں، اس کے اس تصور کے پیچھے جو فکر کارفرما تھی وہ یہ کہ زمین کائنات کا مرکز ہے اور یہ کہ دائراتی حرکت سب سے زیادہ منظم اور کامل ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں یہ تصور بطلیموس کے ذریعے زیادہ وضاحت کے ساتھ مکمل فلکیاتی منصوبے کی بنیاد کا باعث بنا۔ بطلیموس (Ptolemy) کے بموجب زمین کی حیثیت مرکزی تھی جو چاروں طرف آٹھ گردشی کروں سے گھری ہوئی تھی جن میں بتدریج، چاند، سورج، اور پانچ ستارے اور پانچ سیارے (عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل، جو اس وقت تک دریافت شدہ تھے) جڑے ہوئے تھے، سیاروں کے بارے میں بطلیموس کا خیال تھا کہ وہ اپنے اپنے کرہ کے چھوٹے دائروں پر گھوم رہے تھے، اس اسکیم میں سب سے باہری کرے نام نہاد "جڑے ہوئے ستارے" (Fixed Stars) تھے جو ایک دوسرے کی نسبت سے اسی دوری پر قائم تھے، لیکن سب کے سب ایک ساتھ آسمان میں اپنے کرہ پر گردش میں تھے۔ اس آخری کرہ کے باہر کیا تھا کبھی واضح نہ ہو سکا۔

ارسطو کے مرنے کے بعد 310B.C. میں Aristarchus نے نظام شمسی میں سورج کو مرکز مانا، یہ ایک ایسا نظریہ تھا جو 1700 سال بعد قابل قبول ہوا، مؤرخین کے مطابق 500 - 1200ء کا دور یورپ کا تاریک ترین دور کہلاتا ہے، اس درمیان جارج سارٹن (George Sorton) کے مطابق 750ء سے لیکر 1100ء تک یونان کے قدیم فلسفیانہ تصورات، جو پلیٹو، ارسطو، یوکلیڈ، بطلیموس وغیرہ کے مرہون منت تھے عرب سائنسدانوں کے ذریعہ عربی زبان میں ترجمے کی شکل میں محفوظ کر لئے گئے تھے جن سے استفادہ کر کے مختلف موضوعات پر کثیر المقدار اضافہ کیا، تیرہویں صدی عیسوی میں بیت المقدس کی شکست، قرطبہ پر کنگ فرڈینینڈ کا قبضہ اور بغداد پر جو مسلم سائنسی دنیا کا ایک اہم مرکز تھا منگولوں کا تسلط، ایسے اسباب تھے کہ مسلمانوں کا علم مع عربی ترجموں کے ذخائر، اسپین کے راستے سے یورپ پہنچ گیا، تیرہویں صدی کے اوائل میں مسلم سائنسی کارنامے اور دیگر تصانیف عربی زبان سے لاطینی زبان میں منتقل ہو گئیں، راقم الحروف کا ذاتی خیال ہے کہ تمام علمی تصانیف کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ یقیناً لاطینی زبان میں ہوا ہوگا، جس سے مغربی محققین نے قرآن کی علمی اور خاص

طور پر طبی اور فلکیاتی آیتوں سے ضرور استفادہ کیا ہوگا جس کے کچھ ثبوت مندرجہ ذیل تحریر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

اس لمبے عرصے کے بعد 1514ء میں ایک آسان اور عام فہم فلکیاتی ماڈل ظہور میں آیا جس کو پولش پریسٹ کوپرنیکس نے پیش کیا، اس کا خیال تھا کہ سورج مرکز پر ساکت ہے اور زمین اور سیارے سورج کے چاروں طرف دائراتی مدار پر گردش میں ہیں، تقریباً ایک صدی بعد اس تصور پر سنجیدگی سے غور کیا گیا اور جرمن نژاد کیپلر اور اطالوی نژاد گلیلیو (1564-1642) نے کوپرنیکس نظریہ کی مکمل کر تائید کی، گو کہ کوپرنیکس نظریہ (سورج مرکز پر ساکت ہے اور زمین اور سیارے اس کے چاروں طرف دائراتی مدار پر گردش میں ہیں) کیپلر کے بیضوی مدار کے نظریہ سے میل نہیں کھاتا، جہاں تک کیپلر کا سوال ہے، بیضوی مدارات صرف ایک وقتی مفروضہ تھے کیوں کہ بیضوی شکل دائراتی شکل کے مقابلہ میں زیادہ مناسب نہیں ہے، شاید اتفاقاً یہ دریافت کر کے کہ بیضوی مدارات مشاہداتی نتائج سے مطابقت رکھتے ہیں، کیپلر نے حسابی استخراج سے زمین کی گردش کا قانون دیا جو کیپلر لا (Kepler's Law) کہلاتا ہے، اس صداقت کا صحیح تعین 1687ء میں Newton کے نظریہ کشش سے واضح ہوا۔

(ماخذ/ترجمہ Hawking's "A Brief History of Time")

بہر حال مندرجہ بالا سطور سے واضح ہے کہ نظام شمسی کا نظریہ Newton کے نظریہ کشش کی بنیاد پر 1687ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا جو سن ہجری کے مطابق ۱۰۶۶ھ ٹھہرتا ہے، گویا کہ قرآن حکیم کے نزول کے وقت Newton کے ۱۰۶۶ھ سال قبل متعین ہوتا ہے۔

قرآن کے ارشادات

یہ سب اسی کی رحمت کا کرشمہ ہے کہ تمہارے لئے رات اور دن کو سلسلہ وار جاری فرمایا تاکہ رات میں آرام پاسکو اور دن میں اللہ کے فضل سے روزی کی تلاش میں چل پھر سکو اور اسکی ایسی بھاری نعمت پر اس کے شکر گزار بندے بنے رہو" (القصص/۷۳) آیت کریمہ کے مطابق، سورج یا زمین کی گردش کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، صرف دن اور رات کے باری باری آنے اور جانے کا تذکرہ ہے، ظاہر ہے عام مشاہدے کی رو سے دن کا وقفہ زمین پر سورج کی روشنی قائم رہنے کے وقفہ سے متعلق ہے، اگر سورج اور زمین دونوں کو ساکت مانا جائے تو دونوں کے وجود کے وقت سے اب تک زمین کا صرف ایک حصہ ہمیشہ کے لئے روشن ہوتا اور دوسرا حصہ ہمیشہ کے لئے تاریک، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "بھلا بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک رات ہی رہنے دے تو اللہ تعالیٰ کے سوائے کون معبود ہے جو تمہارے لئے روشنی لے آئے" (سورۃ القصص/۷۱) اس لئے قرآن اور مشاہدے کی رو سے دونوں کا ساکت ہونا ناممکن ہے، چنانچہ صرف دو امکان ہیں، اول زمین ساکت ہے اور سورج زمین کے چاروں طرف گردش میں ہے، دوئم سورج ساکت ہے اور زمین اس کے چاروں طرف گردش میں ہے، پہلے امکان سے جو مشاہدے کے قریب لگتا ہے نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ ہر

> اگر سورج اور زمین دونوں کو ساکت مانا جائے تو دونوں کے وجود کے وقت سے اب تک زمین کا صرف ایک حصہ ہمیشہ کے لئے روشن ہوتا اور دوسرا حصہ ہمیشہ کے لئے تاریک۔

روز دن کا وقفہ اور رات کا وقفہ ہمیشہ برابر ہوگا، جب کہ قرآن کے احکامات خصوصاً نماز، روزہ، افطار، سحر کے اوقات کا تعین طلوع اور غروب آفتاب کے اوقات پر منحصر ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے "اللہ کی تعریف اور پاکی بیان کرو اپنے رب کی حمد کے ساتھ طلوع سورج سے پہلے اور غروب شمس سے پہلے (ق/۳۹) جب کہ مشاہدے کے رو سے طلوع و غروب کے اوقات بدلتے رہتے ہیں، یعنی دن اور رات کے طول میں تبدیلی کی وجہ زمین پر سورج کی روشنی کے ٹھہراؤ کا گھٹنا بڑھنا ہے، جس کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ سورج کی رفتار کبھی دھیمی کبھی تیز ہو جو مشاہدے کے منافی ہے، اس بنیاد پر دوسرا امکان ہی استدلالی طور پر صحت کے قریب ہے، یعنی سورج آسمان کے ایک نقطہ پر قائم ہے اور زمین اس کے چاروں طرف گردش میں ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے "نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات، دن پر سبقت لیجا سکتی ہے، سب اپنے اپنے مدار پر تیر رہے ہیں" (یٰس/۴۰)۔

تشریح: مذکورہ بالا آیت سے واضح ہے کہ کسی چیز کو جا پکڑنے کا مطلب ہے کہ پکڑنے والا حرکت میں ہو اور اگر جا پکڑنا اس کے بس میں نہ ہو تو اس میں حرکت ہے ہی نہیں یعنی ساکت ہے، اس لئے قرآن کے مطابق سورج آسمان کے ایک نقطہ پر ساکت ہے، دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو پکڑا جائے وہ قریب تر ہونی چاہئے کیونکہ ایک میل کے فاصلے سے کسی کو نہیں پکڑا جاسکتا ہے، سوائے اس کے کہ وہ چیز چند گز کے فاصلے پر ہو، لیکن پکڑنے والا اگر ساکت اور بے بس ہے تو کوئی چیز چاہے ایک میل پر ہو یا چند گز کے فاصلے پر دونوں حالت میں پکڑ سے آزاد ہے، یعنی چاند، سورج سے دور بھی ہوسکتا ہے اور بہت نزدیک بھی، تیسری بات یہ کہ مشاہدہ کی رو سے چاند زمین کے گرد اپنے مقررہ مدار پر گردش میں ہے۔ ملاحظہ ہو "اور چاند اس کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کردی ہیں، یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ (خمیدہ) کی مانند رہ جاتا ہے" (یٰس/۳۹)۔

تشریح: چاند اگر اپنی روشنی سے منور ہوتا تو ہر رات وہ بدر کامل نظر آتا لیکن قرآن اور مشاہدہ کے مطابق اس کی منزلیں مقرر ہیں، یہاں تک کہ کسی منزل پر وہ ہلال بن کر نظر آتا ہے، یعنی پہلی چیز تو اس کا مدار ہے، دوسری چیز اس کا گھٹنا بڑھنا، یعنی اس کے جزوی حصوں پر روشنی کا گھٹنا بڑھنا جس کو ملا کر مطلب یہ نکلا کہ چاند پر سورج کی شعائیں جتنے حصہ پر پڑتی ہیں وہ حصہ روشن نظر آتا ہے باقی حصے کا نظر نہ آنا زمین کی آڑ کی وجہ سے ہے، جو سورج کی شعاؤں کو چاند تک پہنچنے سے روک دیتا ہے، ہلال کے چاند میں روشنی کا حصہ خمیدہ اس لئے ہوتا ہے کہ زمین کا آڑ گولائی نما ہوتا ہے، اس آڑ کے بدلتے رہنے کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ چاند زمین کے چاروں طرف گولائی میں یکساں رفتار سے گھوم رہا ہے) اب چوتھی چیز جو پہلے بیان کی جاچکی ہے وہ یہ ہے کہ چاند سورج سے دور ہو یا نزدیک ترین، چاند کے گھٹنے بڑھنے کی کیفیت بدستور قائم رہے گی جیسا کہ پورے سال کا انسانی مشاہدہ ہے، یہ اس بات کی مظہر ہے کہ زمین جس کے چاروں طرف چاند گردش میں ہے خود بھی چاند کے ساتھ ساتھ ایک مدار پر حرکت پذیر ہوگی اور چاند کی طرح کبھی بہت دور اور کبھی بہت نزدیک، اب اگر کوپرنیکس اور گلیلیو کے مطابق سورج کو مرکز پر مان کر زمین کو سورج کے چاروں طرف گول مدار پر حرکت مانا جائے تو زمین اور چاند ہمیشہ سورج سے برابر دوری پر ہوں گے جس کے نتیجہ میں زمین پر سورج کی شعاعوں سے پیدا شدہ درجۂ حرارت ہمیشہ ایک جیسا ہوگا جو جغرافیائی اور موسمیاتی، نباتاتی لحاظ سے اور ذی حیات کی ضروریات کے لئے قطعی ناموزوں ہوگا اور اگر ایسا ہوتا تو زمین پر زندگی کے آثار نہ جانے کس شکل میں ہوتے، اس لئے مشیت ایزدی کا تقاضہ کہ سورج ساکت رہے اور زمین اپنے چاند کے ساتھ سورج سے کبھی سب سے دور اور کبھی سب سے نزدیک رہے، انسان کی فلاح کا مظہر ہے، چنانچہ قرآن کی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ زمین پر زندگی کے وجود کے لئے سب سے مناسب نظام شمسی وہ ہے کہ زمین مع اپنے سیارچہ چاند کے ساتھ اپنے محور پر گردش کرتی ہوئی ایک بیضوی مدار پر سفر کرتی رہے اور سورج مرکز پر نہ ہو کر بیضوی مدار کے فوکس (Focus) پر ساکت رہے، اس طرح کئی صدیوں کی ریاضت، تجربات، مشاہدات اور تخمینوں کے بعد گردش زمین کا نظریہ Kepler نے دیا وہ 1066ء سال قبل قرآن حکیم میں موجود تھا (سخت تعجب کی بات ہے کہ قرون وسطیٰ کے مسلمان سائنسدانوں نے لگتا ہے قرآن سے بالکل استفادہ نہیں کیا اور اس کی آیتوں پر غور نہیں کیا، بلکہ یونانی علم و فلسفہ میں الجھ کر رہ گئے۔)

بہر حال جدید طبیعات جس کا سہرا نیوٹن (Newton) کے نظریہ کشش کو جاتا ہے قرآن کی روشنی میں قابل غور ہے، ملاحظہ ہو "اور وہی (اللہ تعالیٰ) آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر گر نہیں سکتا۔" (الحج/۶۵)

تشریح: "اگر مشاہدے کی رو سے دیکھا جائے تو درخت سے کوئی پھل ٹوٹ کر زمین ہی پر گرتا ہے یعنی زمین کے اوپر کوئی بھی بے سہارا چیز زمین پر ہی گرتی ہے، مگر اس بلندی کی کوئی حد ہے جہاں سے کوئی چیز زمین پر گر سکتی ہے کیونکہ چاند بھی زمین کے اوپر سب سے نزدیکی جرم ہے اور ٹھوس ہے وہ زمین پر کیوں نہیں گرتا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے چاروں طرف ایسی قوت کا ایک دائرہ ہے جو اس کو اس دائرے سے باہر جانے میں مانع ہے، جیسے کہ زمین کے گرد ایک قوت کا دائرہ ہے جس میں کوئی چیز باہر نہ جاکر زمین پر گرتی ہے، اس کے علاوہ زمین اپنی حرکت کے دوران بیضوی مدار کے Perihilion (سورج سے سب سے نزدیک نقطہ) پر پہنچتی ہے تو جیسے کہ ارشاد ہوا ہے" کہ سورج کے بس میں نہیں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے یعنی سورج بھی ایک قوتی دائرے میں قید ہے جس کو توڑ کر باہر نہیں جاسکتا، قوت کے انہیں دائروں کو کشش کے دائروں کا نام دیا گیا ہے اور اس طرح دو اجرام فلکی کے بیچ قوت کشش کا ایک نظام قائم ہے، یہی نیوٹن کا نظریہ کشش ہے جس کا اس نے ریاضیاتی قانون دیا، اس طرح ۱۰۶۶ھ سال پہلے ہی قرآن حکیم نے کشش کا تصور بھی دے دیا تھا جس کا آج کی جدید طبیعات کو مرہون منت ہونا چاہئے۔

❖❖❖❖

اپنے خیر خواہوں سے

کام کے پھیلاؤ اور ہوش ربا گرانی نے ندوۃ العلماء کے مصارف بہت بڑھا دیئے ہیں، اس بار مجلس انتظامیہ کے جلسہ میں بھی یہ بات محسوس کی گئی اور متفقہ طور پر طے پایا کہ تحصیل وصول کے نظام پر توجہ دی جائے اور محصلین کا اضافہ کیا جائے۔

بے شک رمضان میں کچھ اساتذہ حضرات بڑے شہروں میں وصولی کے لئے جاتے ہیں اور زیادہ تر زکاۃ کی رقمیں لاتے ہیں جب کہ ادارہ کو زکاۃ سے کہیں زیادہ عطیات کی ضرورت ہے، چنانچہ اس مقصد کے لئے محصلین رکھے گئے ہیں جن کے حلقے اس طرح ہیں۔

مولوی عبدالعزیز صاحب ندوی (کرناٹک) مولوی اکرام الدین صاحب (شہر لکھنؤ، مغربی بنگال) مولوی حفظ الرحمن احمد تھانوی (ہریانہ، پنجاب، ہماچل پردیش، دہلی) مولوی علیم اللہ صاحب (مہاراشٹرا) حافظ عبدالمبین صاحب (مغربی یوپی) مولوی عبدالقدوس صاحب قاسمی (مشرقی یوپی) مولوی شرف الدین صاحب ندوی (راجستھان) مولوی مجیب اللہ صاحب قاسمی (مدھیہ پردیش) مولوی محمد رضوان صاحب قاسمی (گجرات)

ان حضرات کے یہ حلقے پورے سال کے لئے ہیں، رمضان المبارک میں جو استاد یا جو محصل حضرات جن خاص جگہوں پر وصولی کے لئے جاتے رہے ہیں اسی طرح جاتے رہیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض علاقوں اور شہروں میں غیر رمضان میں اب تک ہمارا کوئی آدمی وصولی کے لئے نہیں جاتا تھا، اب بھیجا جارہا ہے۔ اسی طرح جن شہروں میں اساتذہ حضرات رمضان میں زکاۃ کی وصولی کے لئے جاتے ہیں وہاں غیر رمضان میں عطیات کی وصولی کے لئے محصلین حضرات کو بھیجنے کا معمول بنایا گیا ہے لہٰذا ایسے تمام علاقوں کے بھی ہمدردوں سے عموماً اور ندوی حضرات سے خصوصاً درخواست ہے کہ وہ ہمارے محصلین کا تعاون فرمائیں اور غیر رمضان میں بھی مخیّر حضرات کو آمادہ فرمائیں کہ وہ اپنے عطیات وخیرات سے ادارہ کا تعاون کریں۔

(مفتی) محمد ظہور ندوی

ناظر شعبۂ تعمیر وترقی ندوۃ العلماء لکھنؤ

تذکیر باولیاء

مولانا شاہ محمد عبدالرحیم مجددیؒ

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی

(بانیٔ جامعۃ الہدایہ جے پور مولانا شاہ محمد عبدالرحیم مجددیؒ پر مولانا واضح رشید ندوی کی ایک تحریر جس میں نہ صرف بانیٔ جامعۃ الہدایہ کے اوصاف وکمالات پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ سلسلۂ مجددیہ کی خصوصیات اور اس سلسلہ کے بعض مشائخ کا تذکرہ بھی آگیا ہے جس سے اس مضمون کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے) ا۔ش

سلوک وتصوف کے سلسلوں میں نمایاں اور تزکیۂ نفوس کے اعتبار سے ممتاز سلسلہ، سلسلۂ مجددیہ ہے، جس کے سرخیل حضرت امام احمد بن عبدالاحد سرہندی مجددِ الفِ ثانیؒ ہیں، اس سلسلہ کی امتیازی شان شریعت اور سنتِ مطہرہ کی کامل اتباع ہے، اس سلسلہ کے مشائخ، اولیاء، صوفیاء، اتقیاء...... سنت کی پیروی، ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ومحبت اور انسان کی کردار سازی اور اصلاح ودعوت میں ممتاز ہیں، امام مجددِ الفِ ثانیؒ نے اپنے خطوط میں اتباعِ سنت پر ازحد زور دیا ہے، چنانچہ وہ اپنے ایک خط میں رقمطراز ہیں ”خواہشاتِ نفس کے ازالہ کی نیت سے شرعی احکام پر عمل کرنا تاثیر ونفع رسانی میں ہزارہا ہزار سال کی ریاضت ومجاہدہ اور چلوں سے بہتر ہے“۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں ”فضیلت تمام تر سنتِ سنیہ کی پیروی میں ہے اور اعزاز وشرف، شریعت پر عمل کرنے سے مربوط ہے مثلاً وہ قیلولہ جو اتباعِ سنت کی نیت سے ہو، ہزارہا ہزار شب بیداری سے افضل ہے، اور زکوٰۃ کا ایک پیسہ ادا کرنا سونے کے پہاڑ خرچ کردینے سے جو اپنی طرف سے ہو، افضل ہے“۔

سنت کی پیروی اس اصلاحی سلسلہ کا طرۂ امتیاز ہے اس سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے مشائخ کی شہرت و مقبولیت، قدر ومنزلت اور ہردلعزیزی کا بنیادی سبب بھی اتباعِ سنت ہے، خلقِ خدا سے محبت، رحمدلی اور ہر ایک کے ساتھ حسنِ سلوک، حسنِ معاملہ سے پیش آنا ہے، لیکن اس طرح کہ حسنِ سلوک، احقاقِ حق اور دعوت الی اللہ کی کسی مصلحت وحکمت کو متاثر نہ کرے۔

قرآن کریم نے اس وصف کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمہ میں ذکر کیا ہے ارشادِ ربانی ہے، ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ، وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾

مجددی سلسلہ کے بزرگ حضرت آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ کو مقبولیت اور مرجعیت حاصل تھی جس کا تذکرہ 'تاریخ دعوت وعزیمت' میں بھی موجود ہے ”آپ سے ایک خلق نے استفادہ کیا، کہا جاتا ہے کہ آپ سے چار لاکھ مسلمانوں نے بیعت کی، اور ان میں سے ایک ہزار نے علم معرفت کا وافر حصہ پایا، آپ کی خانقاہ میں ایک ہزار آدمیوں سے کم تعداد شاید ہی کسی دن رہتی ہو، حضرت آدم بنوری لاہور تشریف لے گئے تو آپ کے ساتھ دس ہزار اعیان ومشائخ اور ہر طبقہ کے افراد تھے، شاہجہاں بادشاہ ان دنوں لاہور میں تھا، اسے انکی مقبولیت سے تشویش ہوئی، اور آپکو حرمین شریفین کے سفر کا حکم دیا، مدینہ منورہ میں ۱۰۵۳ھ میں انتقال ہوا، اور جنۃ البقیع میں تدفین عمل میں آئی“۔

حضرت آدم بنوریؒ کے اجل خلفاء میں سے حضرت شاہ علم اللہؒ (رائے بریلی) سے متعلق یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک روز اورنگ زیب عالمگیرؒ نے خواب دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے ہیں، عالمگیر کو اس خواب سے تشویش ہوئی اور انہوں نے تعبیر دریافت کی تو معلوم ہوا کہ حضرت شاہ علم اللہ آج اللہ کی رحمت کو پہونچ گئے، حضرت شاہ علم اللہؒ کی امتیازی خصوصیت اتباعِ سنت تھی جس کا ذکر 'سیرت سید احمد شہیدؒ' میں ان الفاظ میں ملتا ہے: ”شاہ صاحب کی سیرت کا اصل جوہر جس نے آپ کو اپنے معاصرین میں ممتاز کر رکھا تھا، عبادات کے ساتھ روزمرہ کی زندگی اور عادات میں بھی اتباعِ سنت، ہمیشہ عزیمت پر عمل اور تقویٰ تھا“۔

حضرت خواجہ محمد معصومؒ کے بارے میں تحریر ہے: ”اللہ کی نشانیوں میں ایک نشانی تھے، آپ نے دنیا کو روشن کیا، اور اپنی توجہات اور بلند حالات کی برکت سے جہالت وبدعت کی تاریکیوں کو کافور کردیا، ہزاروں انسان اسرارِ الٰہی کے ممدوح ہوئے، اور آپ کے شرف صحبت کے سبب کمال درجہ کو پہونچے، نو لاکھ انسانوں نے آپ سے بیعت کی، آپ کے خلفاء کی تعداد سات ہزار ہے“۔

اورنگ زیب عالمگیر بھی حضرت خواجہ محمد معصوم کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور انکے خلیفہ خواجہ سیف الدین سرہندیؒ سے روحانی تربیت حاصل کی۔

شاہ غلام علی صاحب بھی اسی سلسلہ کے بزرگ ہیں، سرسید احمد خاں آثار الصنادید میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم، شام، بغداد، مصر، چین وحبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہوکر بیعت کی، خدمت خانقاہ کو انہوں نے سعادت سمجھا اور قریب ہر گوشہ کے لوگ (مغل ہندوستان پنجاب، اور افغانستان کا تو ذکر ہی نہیں) ٹڈی دل کی طرح امڈتے تھے حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر سے کم نہیں رہتے تھے، اور سب کاروٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا۔

حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ کے خلفاء کا فیض دہلی، حیدرآباد، بھوپال، جے پور، اور دوسرے مراکز رشد وہدایت کے ذریعہ جو ان کے خلفاء نے قائم کئے ابتک جاری ہے۔

صاحب نزہۃ الخواطر حضرت شیخ فضل الرحمان گنج مرادآبادی کے بارے میں رقم طراز ہیں جو خواجہ محمد آفاق کے ارادتمندوں میں تھے، انہوں نے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بھی کسب فیض کیا تھا، انہوں نے اپنے فیوض وبرکات، روحانیت وللّٰہیت، تزکیۂ نفس، طہارت قلب، نفس گرم، زہد وتقویٰ، دنیا کی ظاہری زیب وزینت سے اعراض وبے رغبتی، شریعت مطہرہ کی اتباع، احادیث مبارکہ کی تفہیم وتشریح اور تدریس سے اشتغال، اور ہر معمولی وغیر معمولی چیزوں میں سنت کی پیروی کے ذریعہ ہندستان کے مختلف شہروں خاص طور سے شمالی خطہ کو روشن ومنور کیا۔

سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک عالی نسبت بزرگ مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھیؒ (م۱۹۹۴ء) جنکے شیخ مولانا شاہ بدر علی صاحب حضرت مولانا فضل الرحمان گنج مرادآبادیؒ کے مرید ومجاز تھے، کے متعلق مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ فرماتے ہیں کہ آپ کے اندر غایت درجہ کا تواضع انکساری اور عاجزی تھی، آپ کے اندر خلق خدا سے محبت کا ایسا جذبہ پایا جاتا تھا جو پدری شفقت سے فائق اور ممتاز تھا، ان کا سلسلہ بھی حضرت خواجہ غلام علی صاحبؒ کے خلفاء کے توسط سے خواجہ محمد معصوم صاحبؒ تک پہونچتا ہے۔

حضرت شاہ محمد عبدالرحیم مجددیؒ (م۱۹۹۳ء) مجددی سلسلہ کے مشائخ میں سے تھے انکے جدامجد حضرت شاہ ہدایت علی صاحبؒ کا سلسلہ حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب تک پہونچتا ہے، وہ اس عصر میں اس مجددی سلسلہ کی نشانی تھے، انمیں اس سلسلہ کے علمائے ربانیین، مخلص داعیوں کے نمایاں اوصاف اور خصوصیات، سنت کی پیروی، دعوت واصلاح کی تڑپ، بے چینی وبے قراری، تواضع، عاجزی وانکساری، خلق خدا سے شفقت ومحبت، حسن سلوک، حسن معاملہ، خدمت خلق، دلوں کو مسخر کرنے کی عظیم طاقت وصلاحیت جیسے امتیازی اوصاف جو اس سلسلہ کی نمایاں خصوصیات ہیں، بھرپور طریقہ سے پائے جاتے تھے۔

آپ متانت وسنجیدگی، عزم واستقلال، نشاط اور جوش وولولہ کے ساتھ سرگرمیوں میں متحرک وسرگرم عمل رہنے والے سیماب صفت داعی ومصلح تھے جو اپنی شفقت ومحبت، تواضع وانکساری، عاجزی وبے نفسی، مخاطب کا اکرام واحترام، شریعت کی اتباع، دین ودنیا کی جامعیت، انسانی زندگی کے دقیق معاملات سے آگہی، اور اپنی روحانی وایمانی کشش سے دور دراز کے بے شمار لوگوں کو اپنی جانب رجوع کرنے کی بھرپور طاقت وصلاحیت رکھتے تھے، آپ کا روشن وتابناک وجود ایک ایسے چراغ کے مانند تھا جو تاریکیوں کو روشن اور دلوں کی افسردگی وکبیدگی کو دور کردیتا تھا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم جے پوریؒ ان نابغۂ روزگار اولیاء، صلحا اور مصلحین میں تھے جو اپنی روحانیت وللّٰہیت فیوض وبرکات کی ضیاء پاشیوں سے دور دراز کے علاقوں کو منور اور عطر بیز ہواؤں سے دور دور تک کی فضا کو معطر کردیتے ہیں، آپ نے اپنے فیوض وبرکات سے مخصوص علاقہ اور مخصوص جماعت ہی کو صرف ان صلحاء کی طرح فیض یاب نہیں کیا جو اپنی خانقاہوں میں مقیم رہتے ہیں اور اپنی تمام تر تربیتی کوششیں ایک ہی ایسی مخصوص جماعت پر مرکوز کردیتے ہیں جو ایک مدت تک انکی صحبت وتربیت سے مستفید ہوتی ہے، بلکہ نہایت سرگرم عمل اور فعال، مصلح ومربی تھے، آپ کے نفس گرم سے ہزاروں کے دلوں میں اجالا تھا، اور خلق خدا کی ایک بہت بڑی تعداد کے قلوب میں محبت کی روشنی اور گرمی تھی، علم وعرفان کے اس گوہر شب چراغ سے ایک پورا علاقہ جگمگا رہا تھا سلسلہ مجددیہ کا یہ فیض دور دور تک جاری وساری تھا۔

دعوت وتبلیغ کے میدان میں نقل وحرکت، تگ ودو اور سرگرمی آپ کا سب سے اہم ونمایاں وصف بلکہ جوہر ذاتی تھا، لہٰذا آپ اکثر ہندو بیرون ہند کے دعوتی سفر پر ہوتے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے جب جے پور سے کسی آنے والے سے آپکے بارے میں پوچھا تو اس نے یہی جواب دیا کہ وہ بمبئی یا مدراس، گجرات یا شمالی ہند، لندن یا حجاز یا کسی اور ملک کے سفر پر ہیں، ہر جگہ آپ اپنے محبین، معتقدین اور ارادتمندوں کے اصرار ہی پر تشریف لے جاتے تھے، آپ لوگوں کو خیر وصلاح کی دعوت دیتے، احکام شریعت سکھاتے اور خیر کی طرف رہنمائی فرماتے تھے، آپ کی مجلس خیر وبرکت کی مجلس ہوتی تھی، ان مجلسوں سے فیضیاب ہونے والا محسوس کرتا تھا کہ گویا اس پر رحمت وسکینت نازل ہورہی ہے۔

آپکی طبیعت ومزاج میں شکر، امید ونیک فالی، عالی ظرفی، عزم وحوصلہ، اور ثبات واستقامت کے جوہر نمایاں تھے، زندگی کے تقاضوں پر مثبت وایجابی انداز سے غور وفکر کرتے، مایوسی وقنوطیت کا ان پر سایہ بھی نہیں پڑا تھا، عزم وہمت کے ساتھ ناساعد حالات سے نبرد آزمائی، صحت مند شعور، دینی غیرت وحمیت کے جذبات کے ساتھ دین ودنیا کی خدمت ان کا شعار تھا، ان کے عزم وحوصلہ اور بلند ہمتی کا عکس ان کی مجلس میں بیٹھنے والے پر بھی پڑتا تھا اور وہ بھی اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین وایمان، اور عقیدت ومحبت میں اضافہ کے ساتھ امید واعتماد کی گرمی وروشنی محسوس کرتا تھا۔

اولیاء کرام اور مشائخ عظام کی مجلسیں ان دوکانوں کے مانند ہوتی ہیں جو لوگوں کو دوائے دل فراہم کرتی ہیں، مشائخ واتقیاء اپنے اوصاف وامتیازات، اپنے محبین ومتوسلین اور ارادتمندوں میں منتقل کردیتے ہیں، اور تاریک دلوں کو خدا پر ایمان ویقین کی روشنی، عشق رسول کی گرمی سے منور کردیتے ہیں، اور مردہ دلوں میں بھی زندگی ونشاط کی روح پھونک دیتے ہیں، کم ہمت اور کمزور عزم وحوصلہ والوں کے دلوں کو امن وامان، چین وسکون اور اطمینان کی دولت سے مالا مال کردیتے ہیں، لیکن ایسے بلند وعالی نسبت، اولیاء وصلحا، وربانیین ہر جگہ اور ہر زمانہ میں کمیاب اور عموماً نایاب ہوتے ہیں۔

آپ کی نابغۂ روزگار شخصیت اخیر دور کی خیر وبرکت تھی، آپکے اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے درمیان قلبی وروحانی موانست تھی، اور انکے طریقۂ کار اور ملت کے کاموں میں انکے افکار وتخیل سے ان کو اتفاق تھا، اسکی وجہ سے ان دونوں حضرات کے مابین اتفاق وتعاون کا اچھا ربط تھا، آپ دلوں کو مسخر کرنے والی ایک

عظیم شخصیت کے مالک تھے، آپ نہایت متواضع، منکسر المزاج، بے نفس، صاحب دل، اور شفقت ومحبت کے جذبہ سے سرشار انسان تھے، دعوت وتبلیغ، وعظ وارشاد تعلیم وتربیت کے لئے غایت درجہ حریص وکوشاں تھے، آپ سے ملنے والا آپکے جذبۂ شفقت ومحبت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا، آپ ہر ملنے والے کا غایت درجہ اکرام فرماتے لہٰذا وہ آپ کی مجلس سے اس حال میں رخصت ہوتا کہ اس کا دل آپکی عقیدت ومحبت سے معمور اور تعظیم وتکریم سے آباد ہوتا، آپ کا دعوتی اسلوب ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَة﴾ کا مظہر تھا، آپ کا کلام پر لطف اور آپ کی مجلس پروقار وپرجلال ہوتی، آپ ہر آنے والے کا استقبال اسی قدر گرمجوشی اور خندہ پیشانی سے کرتے کہ گویا آپ ہی اس سے مستفید ہونگے اور آپ ہی کی غرض اس سے وابستہ ہے، آپ کا اپنے اہل تعلق وشیدائیوں سے شفقت ومحبت کا جذبہ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ محسوس کرتا کہ وہی ان کا مقرب ہے اور اس کا ان کے نزدیک خاص مقام ومرتبہ ہے، دعوتی میدان میں تگ ودو، نقل وحرکت، سرگرم عمل، شفقت ومحبت کے جذبہ سے سرشار، سفر وحضر میں تعلیم وتربیت سے اشتغال کے علاوہ آپکی ایک نمایاں واہم خصوصیت جامعیت تھی جس کو آپ کا ہر شیدائی محسوس کرتا، لہٰذا بیک وقت آپ ایک داعی تھے، دعوت وتبلیغ کے اجتماعات میں تقریر کرتے، ایک مصلح تھے اسلاف کے طریقہ پر تزکیہ نفوس وتصفیہ قلوب کا فریضہ انجام دیتے، تعلیم وتعلم کے شیدائی وعاشق تھے، زیادہ سے زیادہ زیور علم سے آراستہ ہونے، معرفت سے سنورنے کی دعوت دیتے، آپ نے اپنے دونوں صاحبزادوں عزیز القدر مولوی فضل الرحیم اور مولوی ضیاء الرحیم کو دار العلوم ندوة العلماء میں داخل کیا، انہوں نے وہاں سے فراغت حاصل کی، اول الذکر علمی وادبی ذوق میں ممتاز، صاحب رائے وصاحب فکر ہیں، اصلاح وتربیت میں اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر گامزن اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے میں کوشاں ہیں، آخر الذکر دار العلوم سے فارغ ہوکر ازہر گئے اور وہاں سے ماجستر (ایم۔اے) کی ڈگری حاصل کی۔

آپ علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ عصری علوم وفنون کے حصول کے داعی اور اسکے لئے کوشاں تھے آپ خود بھی دنیاوی معاملات وامور سے خوب واقف اور زندگی کے مختلف میدانوں میں ماہر وصاحب رائے تھے، آپ نے اپنے بعض بیٹوں کو جدید عصری علوم وفنون کے حصول کی طرف بھی متوجہ کیا۔

آپ کی اس جامعیت کا ایک مظہر وہ ماسٹر پلان ہے جو آپ نے ایک ایسے مدرسہ کیلئے تیار کیا تھا جس کا تعلیمی نصاب جدید وقدیم کا سنگم یعنی دینی اور عصری علوم وفنون کا حسین امتزاج ہو، آپ کے اس عظیم الشان ماسٹر پلان کا پہلا مرحلہ آپکی حیات ہی میں "جامعة الهداية" کی شکل میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا تھا، جو آپکے تعلیمی وتربیتی افکار وتخیل کا مکمل عکاس ہے، آپ نے جامعہ ہدایت کیلئے ایک نہایت لطیف وفنی منصوبہ اپنے افکار وتخیل کے مطابق بنایا تھا، آپ کی خواہش تھی کہ آپکی جامعہ تعلیم وتربیت، دعوت وتبلیغ، اصلاح وارشاد کا ایک بے مثال مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ فن تعمیر میں بھی اپنی مثال آپ ہو، وکامل ہو، آپ کے اس عظیم الشان منصوبہ کی تکمیل میں خاص سیاسی حالات کی بناء پر بہت سی رکاوٹیں بھی پیش آئیں، دشواریوں اور پریشانیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا، اور یہ پلان اپنے تعمیری مرحلہ میں سیاسی دباؤ کا شکار بھی رہا، ان روکاٹوں کے دور کرنے، مشکلات وپریشانیوں کا حل ڈھونڈنے میں وقت کا ایک بڑا حصہ ضائع ہوگیا ورنہ یہ منصوبہ ان کی زندگی ہی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا، اور ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو جاتا، دینی وعصری علوم وفنون کے شعبوں میں تعلیم آپ کی حیات ہی میں آپکے صاحبزادگان مولوی فضل الرحیم مجددی ندوی اور مولوی ضیاء الرحیم ندوی کی سرپرستی میں شروع ہوگئی تھی، مولوی فضل الرحیم مجددی ندوی اسکے ذمہ دار اعلیٰ ہیں اور آپ کے جانشین ہیں، اللہ کی ذات سے امید ہیکہ جامعہ ان حضرات کی سرپرستی میں ترقی کی منزلیں طے کریگا، حضرت شاہ عبد الرحیم مجددیؒ کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا جس کیلئے جامعہ وجود میں آیا تھا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے اپنے خاص ربط وتعلق کی وجہ سے آپ کو شاہ صاحبؒ جامعہ کا سنگ بنیاد رکھنے اور تعلیمی افتتاح کیلئے دعوت دی تھی، اور اکثر ان کو جے پور جامعہ کے اساتذہ وطلبا کی رہنمائی ورہبری کیلئے آنے کی بہ اصرار دعوت دیتے رہتے تھے، آپ کی دعوت پر جامعہ میں رابطۂ ادب اسلامی کا ایک سمینار بھی منعقد ہو چکا ہے، جو نہایت کامیاب سمینار تھا۔

علم وفن اور ادب سے خاص لگاؤ کی وجہ سے آپ کی شخصیت جامعیت کی مظہر تھی، آپکے بارے میں مشہور تھا کہ دعا کی درخواست کرنے والوں کے حق میں آپکی دعا عموماً قبول ہوتی ہے، اور آپ جس جگہ بھی قیام فرماتے ہیں وہاں خیر وبرکت نازل ہوتی ہے، لہٰذا آپ جہاں کہیں بھی تشریف لے جاتے ارادت مندوں کا ازدحام ہو جاتا، متوسلین، ارادتمندوں، اور خاص طور سے پریشان حال، کبیدہ خاطر اور کاروباری لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو جاتا تھا، اور ان کے خیال وگمان کے مطابق انکی امیدیں بر آتی تھیں۔

یہ کمالات آپ کے اوصاف کی چند ایک جھلکیاں ہیں، آپکے آثار وخدمات آپکی نیک وصالح اولاد کی صورت میں (اللہ تعالیٰ انہیں توفیق دے اور ان کی رہنمائی فرمائے آمین) اور عظیم الشان "جامعة الهداية" کی شکل میں، جہاں سے طلباء فیض یاب ہونے کے بعد علماء وفضلاء بنکر نکل رہے ہیں، اور ان افراد کی صورت میں، جن کے دلوں میں آپ نے ایمان ویقین کا بیج بویا تھا، خیر وبرکت کے ساتھ مدتوں باقی رہیں گے۔

﴿احب الصالحين ولست منهم لعل الله يرزقني صلاحا﴾

"میں صالحین واتقیاء سے محبت رکھتا ہوں لیکن ان میں سے نہیں ہوں، شاید اللہ تعالیٰ ان کی محبت کے طفیل مجھے بھی صلاح وتقویٰ سے سرفراز فرمائیں۔" ☆☆

(ترجمانی: قیصر حسین ندوی)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی مکتوب نگاری

ڈاکٹر شمس تبریز خان
استاذ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی نزد خدا وخلق مقبولیت ومحبوبیت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ ملت اسلامیۂ ہند انہیں برابر یاد رکھے ہوئے ہے اور ان کی جدائی کے غم کو سینے سے لگائے ہوئے ہے، ملت کی طرف سے خراج عقیدت کے طور پر ان کی یاد میں بہت سے رسالوں نے نمبر شائع کئے، ان کی کئی سوانح حیات، اور ان کی فکر ونظر سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئی، اسی کے ساتھ مختلف حضرات کے نام ان کے خطوط ومراسلات کے مجموعے بھی شائع ہوگئے ہیں، اب اس کی ضرورت ہے کہ حضرت مولاناؒ کی زندگی اور ان کے علمی ودینی کارناموں کے ہر پہلو پر مستقل طور سے علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالی جائے اور ان کی متنوع، مختلف الجہات اور ہمہ گیر شخصیت کے ہر رخ کو سامنے لایا جائے اور اس سے استفادہ کیا جائے۔

مولانا علی میاںؒ جہاں ایک بڑے عالم دین، کثیر التصانیف وصاحب طرز اور بلند پایہ مصنف واہل قلم تھے وہیں اپنے عہد کے بہت بڑے اور بہت اچھے مکتوب نگار بھی تھے، اس لیے ان کے مکاتیب کو محفوظ اور مرتب کرنے اور پھر ان کے تبصرہ وتجزیہ کی ضرورت ہے تاکہ ان کی افادیت عام ہو سکے۔

یہاں علماء ومشائخ کے مکتوبات ورسائل کی اہمیت کو ذرا گہرائی اور سنجیدگی سے سمجھنے کی ضرورت ہے، علماء ومشائخ یا کسی بھی شعبۂ زندگی سے متعلق اشخاص علم ودین اور اپنے متعلقہ موضوعات پر اظہار خیال کے سلسلے میں بہت مخلص، سنجیدہ اور محتاط ہوتے ہیں اور کام کی باتیں کام کی زبان میں لکھتے ہیں اور عام طور سے غیر ضروری باتوں اور انشا پردازی سے دور رہتے ہیں اس لیے ان کے یہاں علم وزندگی کے حقائق روایتی ادیبوں اور انشا پردازوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

ایک عالم ومفکر اور شیخ ومصلح اور کسی بھی شعبۂ زندگی کا ماہر مکتوب نگار اپنے مخاطب اور مکتوب الیہ کے دل ودماغ میں اپنی بات اتار دینا چاہتا ہے اس لیے ایسے مکاتیب میں اصلیت وواقعیت، خلوص وصداقت، بے تکلفی وبے ساختگی زیادہ ہوتی ہے اور اس وجہ سے ان کی اہمیت وافادیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

عرب وعجم کے بادشاہوں کے درباروں میں سرکاری مراسلت کا پورا محکمہ اور دفتر انشاء (سکریٹریٹ) ہوتا تھا اور اس سے اپنے وقت کے بڑے فاضل ادیب وانشا پرداز وابستہ ہوتے تھے جو شاہی فرمانوں اور خطوط کو بہت بنا سنوار کر لکھا کرتے تھے لیکن آج وہ مجموعے بے جان اور مصنوعی نظر آتے ہیں، جب کہ عربی، فارسی اور اردو میں بھی علماء وفضلاء، صوفیاء ومشائخ کے رسائل ومراسلات اور رقعات ومکتوبات اپنے قیمتی مغز ومواد کے ساتھ ادب وانشاء، سادگی وپرکاری، واقعیت وحقیقت پسندی کا اعلیٰ وعمدہ نمونہ نظر آتے ہیں اور ان میں بڑی تاثیر ودلکشی اور زندگی وتابندگی معلوم ہوتی ہے۔

حضرت یحییٰ منیریؒ، حضرت نظام الدین اولیاء، امیر خسرو، مرزا بیدل، اورنگ زیب عالمگیر، حضرت مجدد الف ثانی، مرزا مظہر جانجاناں، اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، حضرت شاہ عبد العزیز اور حضرت سید احمد شہید رحہم اللہ کے مکتوبات اپنی علمی ودینی اہمیت کے ساتھ ادبی وثقافتی اہمیت بھی رکھتے ہیں اور ان کی تاثیر وقوتِ تسخیر آج بھی مسلّم ہے، اردو میں مثالی ومعیاری مراسلہ نگاری کا سہرا بجا طور پر مرزا نوشہ کے سر ہے اور اس کی امتیازی شان بے تکلفی وبے ساختگی، شائستگی وانسان دوستی ہے ان کے بعد سرسید، مولانا شبلی وحالی، مہدی افادی، ڈاکٹر اقبال، رشید احمد صدیقی رحہم اللہ، اور طبقۂ علماء میں مولانا تھانویؒ، مولانا آزادؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا عبد الماجد دریابادیؒ، مولانا محمد الیاسؒ اور مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے خطوط اپنے اندر بڑی علمی ودینی اور ادبی وثقافتی اہمیت رکھتے ہیں۔

مولانا علی میاںؒ کے خطوط بھی مذکورہ بالا علماء کے خطوط ہی جیسے خال وخط اور رنگ وآہنگ رکھتے ہیں۔

مولانا علی میاںؒ کے مکاتیب مکتوب نگاری کے مسلمہ معیار واصول پر پورے اترتے ہیں، اس لیے مکتوب نگاری کے فن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی ان کی اہمیت افادیت ہے ورنہ علم ودین، اور اسلامی ثقافت ومعاشرت سے تعلق رکھنے والوں کے لیے تو ان کی اہمیت ہر طرح مسلم ہے، اور بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ وثقافت کے علماء وطلبہ کے لیے ان کے مکاتیب کا مطالعہ مفید بھی ہے اور ناگزیر بھی۔

خطوط نگاری کے فن کا ابتدائی تقاضہ مکتوب الیہ کے مقام ومرتبہ اور اس سے مکتوب نگار کے تعلق کی نوعیت کی پوری رعایت کرنا ہے جس پر مولانا علی میاںؒ کے خطوط ہر طرح سے پورے اترتے ہیں، ان کے یہاں حفظ مراتب اور القاب وآداب یا دعائیہ کلمات میں مکتوب الیہ سے تعلق اور اس کی حیثیت عرفی کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے بلکہ عزت افزائی میں تو کسی قدر رعایت ومبالغہ سے بھی کام لیا گیا ہے مگر اس کے برخلاف کسی مکتوب الیہ کی تحقیر وتوہین کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔

مکتوب نگاری کا دوسرا بڑا اصول مکتوب الیہ کی بے تکلفی وبے تصنعی، بے ساختگی وبرجستگی ہے جس کے پیش نظر مکتوب نگار مکتوب الیہ سے بے تکلفی سے گفتگو کے انداز میں مخاطب ہوتا ہے اور ضروری باتیں (جو عام طور پر برسر عام اور سب سے نہیں کہی جا سکتی ہیں) مکتوب الیہ سے کہہ ڈالتا ہے۔ مولانا کے مکتوبات میں بھی

دینی تحفظات بہت کم ہوتے ہیں اور وہ عام طور سے خلوص وسنجیدگی، اور کسی علمی ودینی، معاشرتی واصلاحی مشورے کو اپنے مخاطب تک سادگی وبے تکلفی کے ساتھ پہنچا دینا چاہتے ہیں، اخیر دور کے ان کے اکثر مکتوبات املا کے ذریعہ لکھوائے گئے ہیں اس لیے بھی ان مکتوبات میں گفتگو اور بول چال کا رنگ وآہنگ ملتا ہے اور وہ تکلف وتصنع سے بہت دور ہیں، البتہ ان کی گفتگو اور تحریر کی طرح ان کے مکتوبات میں بھی کہیں کہیں ادب وانشا کی چاشنی، کہیں رعایت لفظی ومعنوی، اور کہیں قافیہ بندی بھی نظر آتی ہے جو ان کے پختہ ادبی مزاج اور ذوق شعری کا برجستہ نتیجہ ہوتی ہے اور اس میں کسی آورد یا شعوری کوشش کا دخل نہیں ہوتا ہے، خطوط کے املا کے دوران اگر رعایت لفظی سے کام لینے کا کوئی موقع آجاتا تو اس سے محظوظ ہوتے اور فائدہ اٹھاتے تھے۔

خطوط نویسی کی ایک بڑی شرط ان کا نجی اور ذاتی معاملات وتعلقات پر مبنی ہونا ہے، اس لیے یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مولانا کے یہاں ایسے خطوط کی تعداد بھی کچھ کم نہیں، لیکن ایسے خطوط کی تعداد زیادہ ہے جن میں وہ مخاطب تو افراد سے ہوتے ہیں لیکن ان کا تعلق جماعت واقوام اور خواص وعوام سے ہوتا ہے اور عمومی انداز کی وجہ سے ان کے اثرات ونتائج بہت دور رس اور ہمہ گیر ہوتے ہیں، اس سے ان کے خلوص، ملی وملکی مسائل سے گہری دلچسپی اور اصلاح احوال کے لیے فکر مندی کا پتہ چلتا ہے، خطوط نگاری کی ایک اور بڑی خصوصیت یعنی کام کی باتوں کو ٹیلی گرام یا ٹیلی فون پر گفتگو کی طرح مختصر اور موضوع تک محدود ہونا چاہئے، اس معیار پر بھی مولانا کے خطوط پورے اترتے ہیں، وہ عموماً مختصر خط لکھتے ہیں لیکن اگر موضوع تفصیل طلب ہو تو کچھ تفصیل سے بھی کام لیتے ہیں مگر اس میں بھی بے جا طوالت نہیں ہوتی نہ سخن آرائی، اور سخن سازی اور خط کو اشعار وحکایات سے سجانے کی کوئی شعوری کوشش ہوتی ہے، بلکہ اکثر انسانی واجتماعی مسائل اور اصلاحی واخلاقی مقاصد ہی سامنے رہتے ہیں۔

وہ ایک کثیر التصانیف مصنف ہونے کے ساتھ ایک بڑے مکتوب نگار بھی تھے لیکن ان کی مکتوب نگاری غالب کی طرح ذوق خامہ فرسائی کی ستم زدہ نہیں تھی بلکہ پھیلے ہوئے علمی ودینی تعلقات ومعاملات کے تقاضوں پر مبنی تھی، اکابر ومشائخ میں اپنے شیخ حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوریؒ، اور ان کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلویؒ، مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحیؒ، شاہ معین الدین احمد ندویؒ، سید صباح الدین عبد الرحمٰنؒ، اور اپنے خردوں اور مسترشدین میں مولانا عبد الکریم پاریکھ، مولانا تقی الدین ندوی، مولانا عبد اللہ عباس ندوی، عبد اللہ نور ولی (جدہ) طارق صاحب (جدہ) وغیرہ کو بہ کثرت خط لکھتے تھے، بعض دنوں میں ڈیڑھ دو درجن خطوط بھی سپرد ڈاک ہوتے تھے، عرصے تک خطوط نگاری کی خدمت میں ہی انجام دیتا تھا، اکثر ایسا بھی ہوتا کہ مولانا ضروری ہدایات و اشارات نوٹ کرادیتے اور میں ان کی روشنی میں جواب لکھ دیتا تھا، خطوط نگاری کے سلسلے میں بعض دلچسپ اور پُر لطف جملے بھی ادا کرتے تھے جیسے کبھی خطوط نگاری کی مناسبت سے کہتے کہ میں بھی بڑا "خطاط" ہوں، کسی خط کا جواب نہ دینا ہوتا تو کہتے کہ "یہ لاجواب خط ہے"۔

خط کا جواب پابندی سے اور عموماً دوسرے دن دیتے تھے اور خطاب میں مخاطب کے مرتبہ اور حیثیت کا پورا لحاظ رکھتے تھے اور اس کے مطابق دعائیہ کلمات لکھتے تھے۔

خط بھی اسی طرح لکھواتے جس طرح مضامین اور کتابیں لکھواتے تھے، یعنی سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ جس میں روانی اور تسلسل قائم رہتا تھا گفتگو اور اپنی زندگی کے عام رویہ کے مطابق کتابوں اور خطوط کی تحریر میں بھی شیریں کلامی اور نرم گفتاری، دل جوئی ودل آسائی اور شفقت ومحبت کی بڑی آمیزش ہوتی تھی، اور تلخ کلامی اور گرم گفتاری کی شاید ہی کبھی نوبت آئی ہو، لوگ اگر کوئی اختلافی یا منفی پہلو رکھنے والی بات لکھ کر انہیں اکسانے کی کوشش کرتے تو وہ بڑی سیر چشمی وکشادہ قلبی اور خندہ جبینی کے ساتھ انہیں یہ شعر لکھ بھیجتے تھے۔

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس
ماقصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

حافظ کے اس شعر کو اپنا ترجمان بنا کر اکثر پڑھا کرتے تھے۔

آسایش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

اردو فارسی ادبیات سے میری دلچسپی کی مناسبت سے کبھی کبھی مجھ سے اچھے شعر سنانے کی فرمائش بھی کرتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر میں نے یہ شعر سنایا تو اپنے مزاج و مذاق کے حسب حال پاکر بہت محظوظ ہوئے۔

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

• • •

ایک اہم گذارش

(ذمہ داران جامعات طالبات سے)

ملک کے طول وعرض میں طالبات کی جو جامعات قائم ہیں ان کے ذمہ داران سے گذارش ہے کہ پتۂ ذیل پر اپنا نصاب (مطبوعہ یا فوٹو کاپی) ارسال فرما کر مشکور فرمائیں، امید ہے اس گذارش پر توجہ فرمائی جائے گی، مقصد اس سلسلے کی خدمات سے مستفید ہوتا اور جدید ومفید کو عام کرنا ہے۔

مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی

جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ (یوپی)

عراق کا دشمن کون؟

(مولانا) نذر الحفیظ ندوی

یہ سوال اس لئے کیا جارہا ہے کہ کیا عراق کے صدر مملکت اور محبوب ومقبول رہنما کی حیثیت سے صدام نے اپنے ملک کو معاشی، سیاسی، فوجی اور سماجی اور اخلاقی حیثیت سے ترقی کی بلندیوں تک پہونچایا، مادی خوش حالی ہی کو حاصل کرنے کے لئے دین واخلاق کو رکاوٹ سمجھ کر صدام اور ان جیسے رہنماؤں نے اپنے ملک کے سو فیصدی مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کے پہاڑ توڑے، صدام نے میشیل عفلق کے اس عقیدے کو عملی طور سے نافذ کر دکھایا کہ لادینیت ہمارا مسلک ہے اور تمام آسمانی مذاہب اور اخلاقی قدروں سے چھٹکارا ہمارا بنیادی مقصد ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس دعوے کے بعد عراق کو مادی ترقی کی کن بلندیوں تک صدام اور ان کے رفقاء نے پہونچایا، اعداد وشمار اور حقائق وواقعات کی روشنی میں ہم فیصلہ آپ پر چھوڑتے ہیں، لیکن یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ آپ صدام حسین کو دین واخلاق کے پیمانے سے ناپیں اس لئے کہ انھوں نے اس کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ وہ تو دین واخلاق کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔

☆ عراق ہمیشہ سے کھجور پیدا کرنے والے ممالک میں سب سے آگے رہا بلکہ یہ حقیقت ضرب المثل تھی کہ دنیا میں سب سے زیادہ کھجوریں عراق میں پیدا ہوتی ہیں، ۱۹۵۸ء تک بتیس ملین کھجور کے درخت تھے، صدام کی پالیسی کی بدولت ۱۹۹۵ء تک ان درختوں کی تعداد دس لاکھ رہ گئی ۱۹۶۲ء تک کھجور سے شکر بنانے کے پانچ کارخانے تھے ان کا بھی خاتمہ ہوگیا، کھجور کے بارہ بڑے باغات کو کاٹ کر ان کی جگہ دواؤں اور برقی ساز وسامان کے کارخانے قائم کئے گئے لیکن دس سال کے اندر یہ کارخانے بند ہوگئے اور شکر بیرونی ملکوں سے منگائی جانے لگی۔

☆ صدام کے دور میں کسانوں کو براہ راست حکومت سے وابستہ کردیا گیا، اس طور پر ان کی پیداوار حکومت خریدنے لگی، وہی ان کو قرضے دینے لگی، دو سال کے اندر ایک کرور دینار زراعتی ترقی کے لئے قرضے دیے گئے مگر منصوبہ بندی کی خرابی سے زمینیں آباد نہ ہوسکیں، بلکہ اسی فیصدی زمینیں بنجر ہوگئیں، اس لئے کہ عراقی کسان اپنی کھیتی چھوڑ کر انقلابی حکومت کی حمایت میں ریلی نکالنے لگے، دوسری طرف دیہات کو چھوڑ کر شہروں میں آباد ہونے لگے۔

☆ بعث پارٹی نے اشتراکیت کے عقائد پر عمل کرتے ہوئے بنجر زمینیں اپنے ممبران کو تقسیم کرکے ان کو حکومتی قرضے دیے تاکہ وہ انھیں قابل کاشت بنائیں، لیکن وزیر زراعت نے یہ شرط لگادی کہ ایک روسی کمپنی اپنے ماہرین کے ذریعہ یہ کام کرے گی، اس مقصد کے لئے جس روسی کمپنی کو ٹھیکہ دیا گیا اس نے دس سال کے بعد یہ کہہ کر کام کرنے سے انکار کردیا کہ ہر قدم پر ہم سے رشوت طلب کی جاتی ہے، اس نے صدام کے تین مقرب وزیروں کے نام لیے کہ ہر ماہ ایک لاکھ دینار تینوں کو دینا پڑتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ دس کروڑ کا خسارہ حکومت عراق کو ہوا۔

☆ زرعی پالیسی کی تنفیذ کی ذمہ داری روسی کمپنیوں پر ڈالی گئی جنھوں نے کسانوں سے زمین چھین کر ان سے مزدوری کا کام لیا، اس کے نتیجہ میں صرف دو سال کے اندر پندرہ لاکھ کسان دیہاتوں سے بغداد آگئے، موصل، بصرہ اور کرکوک کے علاقوں میں کالونیاں بسائی گئیں، اس لئے کہ ان کسانوں کو کارخانوں سے بڑی تنخواہیں اور مادی سہولتیں ملنے لگی تھیں، ۱۹۸۲ء کے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ ۸۰ فیصدی کسانوں نے زراعت کو ترک کرکے کارخانوں میں مزدوری شروع کردی تھی۔

☆ عراقی حکومت نے دجلہ وفرات کے درمیانی علاقوں کو جو ملک کا سب سے زیادہ زرخیز خطہ تھا کسانوں سے زمیں لے کر اپنے ارکان اور حکومت کے وزیروں اور حکام کو دیدیا وہ زراعت سے نابلد تھے، ان سب نے ایسی تمام زمینوں کو روسی کمپنی کو دیدیا، لیکن بیس سال کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ صرف دس فیصدی زمین ہی استعمال کی گئی، باقی زمینیں بیکار رہنے سے بنجر ہوگئیں۔

☆ برقی ساز وسامان تیار کرنے کے کارخانے پر ایک کروڑ دینار خرچ کیے گئے، لیکن ۱۹۸۵ء میں یہ انکشاف ہوا کہ اس پر لاگت زیادہ آتی ہے، اس کے مقابلے میں غیر ملکی برقی ساز وسامان سستے ملتے ہیں، کروڑوں دینار کا سامان گودام میں پڑا ہوا ہے، اس لیے انقلابی کمان نے یہ فیصلہ کیا کہ باہر سے برقی ساز وسامان منگوا کر عراقی ڈبوں میں پیک کرکے فروخت کیا جائے، اس مقصد کے لئے وزیر صنعت کے ذریعہ ایک برطانوی کمپنی کو ٹھیکہ دیا گیا، کمپنی نے الزام لگایا کہ اس کو ٹھیکہ کے لیے دس لاکھ دینار رشوت دینے پڑے، لیکن پھر بھی کسی بلب یا پنکھے کا حصول بغیر درخواست کے ممکن نہ تھا۔

☆ ایک کارخانہ نے صدام کے قریبی عزیز کی تجویز پر یہ منصوبہ منظور کرایا کہ برقی پنکھے کی تیاری کے لئے تیس ملین دینار کے اسٹیل باہری ملکوں سے منگوائے جائیں، اس مقصد کے لئے دس دس آدمیوں کی تین پارٹی جاپان، امریکہ اور ہندوستان بھیجی گئی، ان تینوں پارٹیوں نے مجموعی طور پر بیس لاکھ دینار رشوت لیے، جو سوئزرلینڈ کے بینک میں جمع ہوئے، دس لاکھ ڈالر ان تینوں وفود کے سرکاری دورے پر خرچ ہوئے، یہ سوال نہ کیجئے کہ وہ اسٹیل خریدنے کے بعد کہاں گئے۔

☆ دواسازی کے چار بڑے کارخانے قائم کیے گئے ان پر دو کروڑ عراقی دینار خرچ کیے گئے، لیکن ان دواؤں کو کوئی خرید نہیں سکتا تھا کہ وہ سرکاری اہل کاروں کی غفلت اور کام چوری کی وجہ سے گودام میں سڑتی رہتی تھیں، ۱۹۸۲ء میں ایک اسکینڈل سے معلوم ہوا کہ دو کروڑ کی ایسی دوائیں حکومت نے فروخت کردیں جن کی تاریخیں گذر چکی تھیں، بعض دواؤں پر دو سال گذر

چکے تھے، چونکہ حکومت کی اجارہ داری تھی اس لئے لوگ ایسی دوائیں خریدنے پر مجبور تھے، اس کے نتیجہ میں اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق پچاس ہزار بچے ہلاک ہوگئے۔ جب امریکہ نے عراق پر پابندی لگائی تو اس کے اثرات ظاہر ہوئے۔

☆ عراقی حکومت نے ٹائر ٹیوب خریدنے کے لئے دو وفد امریکہ اور جاپان بھیجے، دونوں نے دس دس کروڑ کے سودے کئے، لیکن ایسے ٹائر خریدے جواز کار رفتہ ہو چکے تھے، چونکہ حکومت ہی کے پاس اس کا ذخیرہ تھا اس لئے عراقی ان کی خریداری پر مجبور تھے، اس کے نتیجہ میں کثرت سے موٹروں کے حوادث پیش آئے اس اسکینڈل کا انکشاف اس وقت ہوا جب ایک وزیر صاحب گاڑی کے حادثے میں مارے گئے حکومت پر اعتراضات ہوئے تو کہا گیا کہ آب ہوا اور گودام میں درجہ حرارت کی وجہ سے ان ٹائروں پر اثرات ہوئے اور وہ کمزور ہوگئے، ایک تکریتی وزیر کے پاس اس کا لائسنس تھا۔

☆ عراق کی سرزمین اتنی زرخیز تھی کہ وہاں کہ سبزیاں سعودی عرب، کویت، ترکی، اردن، ایران سپلائی کی جاتی تھیں، ہر قسم کے پھل اتنی کثرت سے پیدا ہوتے کہ ترکی کے راستے مشرقی یورپ کے ممالک تک ان کی سپلائی ہوتی، لیکن انقلاب کی برکتوں سے حال یہ ہوگیا ہے کہ ٹماٹر، آلو، سیب، انگور، نارنجی حتی کہ پیاز تک کے لئے لمبی لائن سرکاری دوکانوں کے سامنے لگتی، دو گھنٹے کی لائن کے بعد بھی اس کی ضمانت نہیں کہ انڈے کی ایک ٹرے یا سبزی کا ایک کرتون مل جائے، اگر کوئی چیز آپ کو نہ ملے تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ دو گھنٹے ضائع کرنے کے بعد بھی انڈے نہیں مل سکے، ڈبل روٹی اور دودھ کا ڈبہ نہیں مل سکا، یہ بھیانک جرم ہے، ایسا کہنا گویا صدام پر تنقید کرنا ہے جس کی سزا پھانسی ہے، یہ واقعہ ہے کوئی لطیفہ نہیں کہ ایک ساٹھ سالہ بزرگ چار گھنٹے کی لائن کے بعد بھی انڈے حاصل نہیں کر سکے تو انھوں نے یہ کہہ دیا کہ اتنا وقت ضائع ہوگیا، چار دن سے آرہا ہوں، یہ سننا تھا کہ خفیہ پولیس نے ان کو اپنے ساتھ لیا اور کہا کہ چلئے آپ کو انڈے سرکاری اسٹور سے دلواتا ہوں اس بزرگ کو تھانے لاکر دو ٹرے انڈے ان کے سر پر توڑے گئے، پھر ان کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا گیا کہ اب کبھی شکایت کروگے تو پھانسی ہی پاؤگے۔

☆ ہر قسم کی تجارت پر حکومت نے قبضہ کرلیا تھا اس لئے سارے وزیر اور ان کے رشتہ دار تاجر اور ٹھیکہ دار ہوگئے تھے، کوئی دس فیصدی سے کم پر راضی نہیں ہوتا تھا، اگر اس کا تعلق تکریت سے ہوتا جہاں کے صدام رہنے والے تھے تو یہ پچاس اور ستر فیصدی تک پہنچ جاتا تھا، مثال کے طور پر صدام کے قریبی عزیز برزان تکریتی وزارت صنعت کے ہر سودے پر چالیس فیصدی لیا کرتے تھے، ان کے بقول اس میں سے تیس فیصدی عدی اور قصی کو ملا کرتے تھے، صدام کے بارے میں یہ بات انھوں نے ہی بتائی کہ عراق میں جو اعلیٰ درجہ کا پیٹرول نکلتا تھا اس کی ساری آمدنی صدام کے حساب میں امریکہ و سوئزرلینڈ میں جمع ہوتی تھی، دوسرے قسم کے پیٹرول عراقی سفراء اور وزراء فروخت کیا کرتے جیسا کہ اسپین میں متعین عراقی سفیر نے کہا تھا۔

☆ بصرہ کے ساحل پر غیر ملکی موٹروں کا گودام تھا، جہاں سے پرزے اور انجن چوری کر کے بغداد کے بازاروں میں فروخت کردیے جاتے تھے، سال کے آخر میں جب چیکنگ کا وقت آتا تو شارٹ سرکٹ کے نتیجہ میں آگ لگادی جاتی، اس طرح ہر سال سینکڑوں گودام اور سرکاری فائل جلادیے جاتے تاکہ جرائم کے ثبوت ختم کردیے جائیں۔

☆ پچاس ہزار ٹن شکر خرید کر بصرہ کی بندرگاہ پر لائی گئی تو سال بھر بعد صرف دس ہزار ٹن تھی، تحقیقات کے بعد یہ بتایا گیا کہ چوہے چالیس ہزار ٹن کھا گئے۔

☆ ہندوستان کے بجائے سری لنکا سے چائے کی خریداری کے لئے ایک عراقی دلال نے دس لاکھ دینار کمیشن لئے، جس کو پرمٹ دلایا اس نے مزید چار وزیروں اور عراقی سفیر کو دس فیصدی کمیشن دیے۔

پچاس لاکھ ماچس کی ڈبیہ خریدی گئی لیکن جب بصرہ کی بندرگاہ پر پہونچی تو صرف دس لاکھ تھی، وجہ یہ بتائی گئی کہ پانی پڑنے سے ماچس خراب ہوگئی، اور اسے سمندر میں ڈالنا پڑا، اسی پر بس نہیں ہوا بلکہ ہر ماچس کے اندر صرف اٹھ تیلی تھی جب کہ بیس تیلیاں ہوتی ہیں۔

☆ خواتین کا لباس تیار کرنے والے عراقی کارخانے نے حکومت کے ڈپارٹمنٹل اسٹور کے ہاتھ ردی قسم کے تیار کئے ہوئے لباس دس لاکھ دینار میں فروخت کردیے جب کہ عام بازاروں میں اس کی قیمت پچاس ہزار دینار تھی، اس لیے کہ اس کا فائدہ صدام کی بیوی کو ہوا۔

☆ یہ مثالیں تو ہزاروں میں سے چند ہیں اور ان کا تعلق رشوت ستانی اور مالی فساد اور خیانت سے تھا، ورنہ انسانی سطح پر جو خوفناک واقعات صدام کے صدارتی عہد میں پیش آئے انھیں پڑھ کر انسانیت کی پیشانی عرق آلود ہوجاتی ہے اور درندے غنیمت معلوم ہونے لگتے ہیں۔

☆ صدام نے جس خوں ریزی اور سفا کی سے اپنی حکومت کا آغاز کیا وہ خون صرف ان ہی کے منہ کو نہیں لگا بلکہ ان کے تمام وزراء، حکام اور سرکاری افسران کے منہ لگ گیا، جیسے ہسٹریا یا پاگل پن کا کوئی زبردست دورہ پڑ جائے، وہی حال صدام کا آخری دور تک رہا، اب اسکے بھیانک انکشافات ہورہے ہیں، اور یہ بتایا جارہا ہے کہ اجتماعی قبروں میں ہزاروں بے گناہوں کو زندہ دفن کردیا گیا، کویت پر قبضہ کے بعد ساٹھ ہزار عراقیوں کی تلاش ہورہی ہے کہ وہ کہاں گئے۔

☆ عرب اخبارات سے معلوم ہوتا کہ بغداد، موصل، کرکوک، بصرہ، السلیمانیہ، اربیل، نجف اور کردوں کے علاقوں میں اجتماعی قبریں ملی ہیں، بغداد کے قریبی علاقوں میں درجنوں ایسے اجتماعی قبروں کا پتہ چلا ہے، ان اجتماعی قبروں میں شناختی کارڈ، قلم، گھڑی، نقد رقوم سکوں کی شکل میں برآمد ہورہے ہیں، ۱۹۹۰ء سے پہلے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۷ء تک صرف کردوں کے خلاف صدام نے جو معاملہ کیا ان کے مطابق کردوں کے چار ہزار تین سو قصبات اور شہروں کو یکسر تباہ کردیا گیا، ان علاقوں کی پوری آبادی کو ہجرت پر مجبور کردیا گیا، ایک لاکھ بیاسی ہزار کردوں کو حکومت نے آٹھ سال کے اندر غائب کردیا، حلبچہ پر کیمیکل گیس کی بمباری سے جو کرد ہلاک ہوئے ان کی تعداد لاکھ سے کم نہیں زیادہ ہی

ہے، انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیم نے ۱۹۸۷ء، ۸۸ء، اور ۱۹۹۰ء میں تین رپورٹیں جاری کی تھیں، ان سب میں اس نے عراقی حکومت پر الزام لگایا تھا کہ بغیر مقدمہ کے پچاس ہزار کردوں کو پھانسی دیدی گئی، ۳۰/مارچ ۱۹۸۷ء کو تین سو ستر کرد بچوں کو سلیمانیہ شہر کے اسکولوں سے گرفتار کیا گیا، بعد میں سلیمانیہ کی سڑکوں پر ایک مہینہ تک ان کی مسخ شدہ لاشیں پائی جاتی رہیں، ان پر ٹارچر کے نشانات تھے، ۲۵/اکتوبر ۱۹۸۵ء کو پھر تین سو طالبعلموں کو گرفتار کر کے انھیں اجتماعی طور پر قتل کردیا گیا، بعد میں ان کے والدین کو بھی قتل کردیا گیا۔

☆ جن گھروں میں مرد نہ تھے وہاں سے خواتین کو مع کمسن بچوں کے گرفتار کیا جاتا، ایسی خواتین کی تعداد ستر ہزار بتائی جاتی ہے جن کو ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۰ء تک کے عرصہ میں اس طرح ختم کیا گیا کہ ان کے شیر خوار اور دس سال تک کے بچوں سے الگ رکھا گیا، دوسرے کمروں میں وہ خواتین اپنے بچوں کو بھوک اور پیاس سے بلبلاتے ہوئے دیکھتی تھیں، لیکن بے بس تھیں، اپنے جگر کے ٹکڑوں کو یوں بے بسی سے مرتے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اکثر عورتیں پاگل ہوجاتیں یا سر دیواروں سے ٹکرا کر مرجاتیں، ان خواتین کے ساتھ جو بدترین سلوک کیا جاتا ان کے تصور ہی سے انسانیت کی پیشانی عرق آلود ہوجاتی ہے۔

☆ بین الاقوامی انسانی حقوق کی تنظیم نے بار بار عراقی حکومت سے احتجاج کیا مگر اس نے کسی احتجاج کا جواب نہیں دیا، جب کہ بیشتر واقعات کے ساتھ ساتھ تصاویر اور دستاویزات موجود تھے۔

☆ صدام کے دور میں بڑی تعداد میں عراقیوں کو اجتماعی ہجرت پر مجبور کیا گیا، ۱۹۷۱ء میں اسی اجتماعی ہجرت کا طوفان برپا ہوا تو ان دس لاکھ عراقیوں کو ایرانی سرحد کی طرف دھکیل دیا گیا جن کے دادا پردادا ایران سے عراق آکر بس گئے گئے، عراقی فوج پہلے ایسے تمام لوگوں کو جمع کر کے ان کے شناختی کارڈ، راشن کارڈ، جائیداد کی دستاویزات حاصل کر لیتی، پھر ان سب کو نذر آتش کر کے ایک گھنٹے کے اندر گھروں سے بندوق کے زد پر نکلنے پر مجبور کردیتی، معذوروں اور خواتین اور بیماروں کے درمیان کوئی تفریق نہ کرتی، ٹرکوں میں ان سب کو لاد کر ایران کی سرحد پر چھوڑ دیتی اور فوج انھیں گھیر کر فائرنگ کر کے ایرانی سرحد کے اندر داخل کردیتی۔

☆ عراقی وزارت داخلہ نے ۱۰/۴/۱۹۸۰ء کو اپنے خط نمبر ۲۸۸۴ کے ذریعہ حکام کو اطلاع دی کہ ایسے تمام دو ہزار خاندانوں کو ایران بھیجدیا جائے جن کے آباؤ اجداد ایرانی تھے، جو فوج میں ہوں ان کو گرفتار کر کے پھانسی دیدی جائے تاکہ وہ بعد میں عراق کے خلاف انتقام نہ لے سکیں، چنانچہ ۱۸ سے ۲۸ سال کے ایسے تیس ہزار نوجوانوں کو اسکولوں اور فوجی مراکز سے گرفتار کر کے پھانسی دیدی گئی۔

۱۹۸۵ء میں اجتماعی ہجرت کا دوسرا طوفان آیا جس میں آٹھ لاکھ کردوں کو ترکی کی سرحد تک دھکیل دیا گیا، ان پر تو مسلسل بمباری کی جاتی رہی، برطانوی اور امریکی جہازوں سے ان پر بمباری کروائی گئی، پہاڑوں پر پناہ لینے والے جماعت الانصار کے لوگوں پر کیمیکل بمباری کی گئی۔

صدام نے ایران کے ساتھ جنگ چھیڑ کر دونوں ملکوں کے لاکھوں بے گناہوں کو تباہ و برباد کیا، نہ صرف عراقی وسائل کو برباد کیا بلکہ دوسرے عرب ملکوں کو ڈرا دھمکا کر کروڑوں ڈالر وصول کئے۔

مجموعی طور پر دو لاکھ عراقی فوجی اس جنگ میں مارے گئے، اپنے ایرانی بھائیوں کے ہاتھوں تو بیچارے عراقی مارے ہی گئے خود اپنی حکومت کے ہاتھوں بھی عراقی فوجی مارے گئے، پچاس ہزار عراقی فوجی جو زخمی ہوئے تھے ان سب کو انجکشنوں کے ذریعہ یہ کہہ کر ختم کردیا گیا کہ "ان کا وجود ملک کے لئے بوجھ ہے"، عین جنگ کے میدانوں میں حالت جنگ میں بھی کورٹ مارشل کے ذریعہ ایسے عراقی فوجیوں کو بلا تردد پھانسی دیدی جاتی جن سے ذرا بھی کوتاہی ہوتی یا یہ الزام ہوتا کہ انھوں نے افسران کے حکم سے سرتابی کی، یا اس جنگ پر تنقید کی۔

اپنے ماموں زاد بھائی اور عراقی وزیر دفاع عدنان خیر اللہ کو ہیلی کوپڑ کے حادثے میں صدام نے مروادیا ان کے ساتھ عراقی فضائیہ کے تیس فوجی افسران بھی تھے۔

بغداد کے قریب قصر الرحاب نام کا ایک محل تھا جس میں اسی چھوٹے بڑے کمرے اور ہال تھے، اس کو صدام نے قصر النہایہ نام دے کر جیل میں تبدیل کردیا، ایک عراقی جیلر نے یہ اعتراف کیا کہ صرف ایک دن میں پانچ ہزار قیدیوں کو تیزاب کے حوض میں ڈال کر جلادیا گیا تھا، ایک مشین مشرقی جرمنی سے ایسی لائی گئی تھی جس میں بیک وقت اٹھارہ انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا جاتا تھا عراقی ظالموں نے مطالبہ کیا کہ اگر مشرقی جرمنی ایسی مشین بنادے جس میں بیک وقت ایک ہزار انسانوں کو پیس دیا جائے تو ہم اس کو خریدیں گے، اس مشین کی خریداری کے کاغذات کا حوالہ اخبارات میں بھی آیا تھا، غرض کہ انسانوں کے ٹارچر کے تیس سے زائد طریقے اس قصر النہایہ میں استعمال کئے جاتے تھے، اکثر تو بغیر مقدمہ کے گرفتاری کی جاتی، عراق میں چالیس ایسے جج بنائے گئے تھے جن کے پاس سکنڈری اسکولوں کے جعلی سرٹیفکٹ تھے، ۱۹۶۹ء میں ایسے ۲۱۸ لوگوں کو بجلی کے ستونوں پر لٹکا کر پھانسی دیدی گئی جن کے بارے میں حکومت نے خود اعتراف کیا کہ وہ بے گناہ پکڑے گئے تھے۔ اصل مجرم دوسرے تھے۔

برزان تکریتی نے ایک ایسے شخص کو دس لاکھ دینار لے کر چھوڑ دیا جس نے ستر عراقیوں کو قتل کیا تھا، اس کے بدلے ٹارچر سے پاگل شخص کو یہ کہہ کر پھانسی دیدی گئی کہ یہی اصل مجرم تھا۔

ایسا کثرت سے ہوا کہ سیاسی مخالفین کو ٹارچر کے بعد چھوڑ دیا گیا، لیکن بعد میں پھر انھیں زہر دے کر یا ان کا غنڈوں کے ذریعہ قتل کردیا گیا، تین سو سے زائد فوجی جنرلوں، سات سو اسی کے قریب سائنسدانوں، اقتصادی ماہرین، ایٹمی انرجی کے ماہرین انجینئروں کو پھانسی دیدی گئی، صرف شک کی بنیاد پر کہ وہ بعث پارٹی کے ممبر نہیں تھے۔

غرض کہ صدام کا پورا دور خوں ریزیوں اور سفاکیوں سے بھرا ہوا ہے، ایسا دشمن انسانیت جو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے اور چنگیز و ہلاکو بھی اس کے آگے شرما جاتے ہیں، اکثر عراقیوں نے یہ کہا کہ اگر ہم پر یہودی حکمراں ہوتے تو ہمارے ساتھ ایسا سلوک ہرگز نہ ہوتا۔

("آخری قسط" صدام کی ذاتی زندگی کی ایک جھلک" اس موضوع پر آئندہ شمارے میں انشاء اللہ) ☆☆☆☆☆

ولادت کے بعد تحنیک سنت ہے

(مولانا) محمد خالد ندوی غازیپوری

ولادت کے پہلے دن جس طرح بچے کے کان میں اذان و اقامت مستحب ہے، اسی طرح تحنیک بھی سنت ہے، تحنیک کے معنی کھجور یا کوئی چیز منہ میں لے کر خوب چبانے کے ہیں جب وہ گھل کر لعاب دار ہو جائے تو بچہ کو چٹانا سنت ہے، مستحب یہ ہے کہ کسی بزرگ عالم دین، متقی پارسا سے یہ عمل کرایا جائے تاکہ بچے کے اندر اس کے اثرات پیدا ہوں، پہلی چیز جو بطور غذا کے اس کے جسم کا حصہ بن رہی ہو، اس میں اللہ کے نیک بندے کے لعاب دہن کی آمیزش ہو، بچے کی نشو و نما، اس کی ذہنی، فکری، علمی اور روحانی صلاحیتوں کو فروغ پانے میں اس عمل کا خاصا اثر ہے، شریعت کا کوئی کام بے مقصد نہیں ہے، اور اس لئے بھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صحابہ کرام اپنے نومولود بچوں کو لاتے تھے، اور آپ تحنیک فرما کر بچے کو چٹاتے اور برکت کی دعا فرماتے تھے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ میرے یہاں بچہ تولد ہوا تو میں اسے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچہ کا نام ابراہیم رکھا کھجور سے تحنیک فرمائی، اور اس بچہ کے حق میں برکت کی دعا کی اور میرے حوالے فرمایا۔ (متفق علیہ)

حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ ہجرت کے دوران میں امید سے تھی، حمل کا زمانہ پورا ہو چکا تھا، مدینہ منورہ پہونچکر قباء میں قیام ہوا، وہیں عبد اللہ بن الزبیر کی ولادت ہوئی، تو میں بچہ کو لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور آپ کی گود میں دے دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کھجور طلب کیا، اس کو چبلایا، پھر بچے کے منہ میں تھتکایا اور منہ میں لعاب دہن (جو کھجور کا آمیزہ تھا) ڈال دیا، یہ پہلی غذا تھی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لعاب دہن کے ساتھ بچہ کی پیٹ میں پہونچی، پھر آپ نے بچہ کے لئے برکت کی دعا کی۔ (متفق علیہ)

حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا کہ میرے بھائی عبد اللہ بن ابی طلحہ کی جب ولادت ہوئی تو میں انھیں لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ اپنے اونٹ کو دوا لگا رہے تھے، فرمایا! تمہارے پاس کوئی کھجور ہے؟ میں نے کہا جی ہاں: آپ نے چند کھجوریں لیں، اور منہ میں لے کر خوب چبلایا، جب وہ لعاب دہن کا آمیزہ بن گئیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحنیک فرمائی، بچہ نے منھ کھولا تو آپ نے اس کے منہ میں اپنا لعاب ٹپکا دیا، بچہ منہ چلا کر لعاب دہن کو چاٹنے لگا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ کھجور انصار کو بہت مرغوب ہے، اور آپ نے میرے نومولود بھائی کا نام عبد اللہ رکھا (بخاری، مسلم، ابوداؤد)۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ولادت کے پہلے دن تحنیک کے ساتھ نام بھی رکھا جا سکتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ولادت کے بعد زچہ اور بچہ کو گھر سے نکلنے میں کوئی حرج نہیں، آج بھی خاص طور سے دیہاتوں میں ۶/ روز سے پہلے زچہ اور بچہ کو گھر سے باہر نکلنا، لے جانا اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے، اور گھر کے دروازہ پر آگ جلائی جاتی ہے، کوئی لوہے کا ٹکڑا بچہ کے سرہانے رکھا رہتا ہے، اور ایسا اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ بچہ کو آسیب نہ چھولے، سب توہمات ہیں، غیر مسلموں کے ساتھ رہنے سے ہماری معاشرت بہت حد تک متاثر ہوئی ہے۔

تحنیک کا طبی فائدہ بھی ہے، اطباء کہتے ہیں لعاب دہن کے ساتھ بچے کے پیٹ میں ایسے صالح جرثومے منتقل ہو جاتے ہیں، جو بچے کے نظام ہضم میں معاون ہوتے ہیں، بہر کیف ہمارے لئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سنت ہونا ہی کافی ہے، دین و دنیا کی سعادت اسی میں مضمر ہے۔

☆☆☆

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی اہم کتاب

﴿حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ﴾

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ کی مفصل، جامع اور متوازن سوانح حیات، جس میں ان کے یقین آفریں اور ایمان افروز حالات و معمولات کے ساتھ ان کی طبعی خصوصیات، دینی کوششیں، علمی خصوصیات و خدمات اور انسانی و اسلامی اخلاق پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ جس سے عصر حاضر میں بلند و باکمال اسلاف کی سیرت کی اتباع اور صحیح روحانی ترقیات کا ثبوت ملتا ہے، احیائے سنت کا ذوق اور اتباع سنت کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

دیدہ زیب کتابت وطباعت قیمت -/90۔

اپنے قریبی بک سیلر سے حاصل کریں یا -/90 روپے بھیج کر بذریعہ رجسٹری کتاب حاصل کریں۔

ناشر:-

مکتبۂ اسلام ۵۴/۳/۷ احمد علی لین، گوئن روڈ لکھنؤ 226018

ڈاکٹر خواجہ افضل امام کا مقالہ

”علی قلی تہرانی —— حیات اور کام“

تعارف وتبصرہ

جناب ڈاکٹر خواجہ افضل امام صاحب کا پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ میرے پیش نظر ہے، یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ یہ مقالہ آج سے ۵۰/ سال پہلے تیار کیا گیا تھا اور اس کے اشاعت کی نوبت اب آئی، انگریزی کی مثل ہے کہ کسی اچھی بات کا دیر سے ہونا اس سے بہتر ہے کہ وہ نہ ہو، یوں بھی شراب کہنہ کا لطف اور ہی ہوتا ہے۔

یہ مقالہ دور شاہ جہانی کے ایک غیر معروف شاعر سلیم تہرانی کے کام پر ہے، جو ایران سے ہندوستان آئے کچھ دن اُمرائے دربار کی سرپرستی میں رہے اور پھر کشمیر میں آسودۂ خاک ہو گئے۔

اس مقالہ کے تیار کرنے میں صاحب مقالہ نے جو سفر کئے، جو کتبخانے کھنگالے اور جو محنت کی وہ مجھے ان حدیث کے راویوں کی یاد دلاتا ہے جو کسی حدیث کو پانے کے لئے یا اس کی صحت کے متعلق یقین کرنے کے لئے نہ معلوم کتنے سفر کرتے تھے، ایسے سفر جو آج کل کی راحتوں کے ساتھ نہیں ہوتے تھے بلکہ دشت وصحرا کے سفر جو بے سروسامانی کے ساتھ ہوتے تھے اور کوئی سنگ میل راہ دکھانے کے لئے بیچ میں نہیں آتے تھے یہ تشبیہ میں نے صرف محنت اور عزم کے لئے دی ہے، وجہ سفر سے کوئی مماثلت نہیں، مقالہ نگار کبھی رام پور میں کام کرتے نظر آتے ہیں، کبھی دہلی کے راشٹر بھون میں، کبھی راجہ بنارس کے کتبخانوں میں، کبھی کلکتہ کے ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں اور کبھی نیشنل لائبریری میں، کبھی حیدر آباد کے آصفیہ لائبریری میں اور کبھی یاور جنگ میوزیم میں اور آخر میں جہاں دیکھے گئے وہ علی گڈھ کی حبیب گنج لائبریری تھی، برٹش میوزیم سے بھی غائبانہ معاملہ رہا۔

یہ جدو جہد تو جسمانی اور دانشوری کی تھی مگر اخراجات کے لئے بھی انھوں نے صرف اپنے مالی وسائل پر بھروسہ کیا اور کہیں سے کوئی مدد نہیں لی، ان کی تمہید کا اہتمام جس شعر پر ہوا ہے وہ انتہائی منفرد اور دلچسپ ہے اور اس تحریر لکھنے والے کو اس کا اقرار ہے کہ اس نے دست سوال کے سوجانے اور طلب کرنے کے لئے حقارت سے متعلق تو بہت شعر پڑھے ہیں لیکن ایسا نہیں، میں اس کا ترجمہ لکھ دیتا ہوں ”میری برہنہ پائی کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ساری دنیا کے سر پر اپنے پاپوش کو مارا ہے“ خیال آتا ہے کہ اگر وہ اپنے پاپوش کا ایسا لامحدود استعمال نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔

یہ مقالہ جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے بڑی عرق ریزی سے تیار کیا گیا ہے، مشکل یہ ہے کہ شاعر فارسی کا ہے اور مقالہ انگریزی میں لکھا ہوا، اس لئے اس کا لطف اٹھانے والے وہی لوگ ہوں گے جو دونوں زبانوں سے اچھی طرح شناسائی رکھتے ہوں اور ایسے لوگ اب کم ہو گئے ہیں، مگر یہ ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ لکھنے والوں کے لئے بہت کارآمد ہوگا کیونکہ انھیں مقالہ لکھنے کا سلیقہ آئے گا، کیسے عنوانات بنائے جاتے ہیں تمہید میں یہ لکھنا کہ مقالہ کی افادیت کیا ہے، اگر صاحب مقالہ کوئی فرد واحد ہو جیسا کہ یہ مقالہ ہے تو پھر اس کی زندگی کے مختلف ادوار، اس کا مزاج، اس کی پسند اور ناپسند، ہم عصروں سے اس کا تعلق اور ان کے درمیان اس کا مقام، اس کے سرپرست، اس کا کام، اس کے اسٹائل، اس کی کمزوریاں غرض ہر موضوع کے لئے ایک باب باندھا جا سکتا ہے۔

مقالہ کی تیاری کے سلسلے میں کیسے سوانح عمریاں، رسائل، تاریخی کتابوں کا استعمال حوالہ کے ساتھ کیا جاتا ہے، کیسے انڈکس یا ببلو گرافی تیار کی جاتی ہے، یہ مقالہ نئے مقالہ نگاروں کے لئے بہترین رہنما ہے۔

میری اس تشبیب کو جملۂ معترضہ سمجھا جائے کیونکہ مجھے تو مقالہ پر کچھ لکھنا ہے، معذرت کے ساتھ آگے بڑھتا ہوں۔

سلیم تہرانی معروف شاعر نہیں ہیں، ان کا تذکرہ لکھنے والوں نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے، ان کے معاصر صائب، طالب، کلیم اور قدسی تھے، جیسا روشن ان شاعروں کا کام تھا اور جیسی روشنی ان پر ڈالی گئی، وہ نور علیٰ نور والی بات تھی مگر اس شاعر کی شمع بھی پروانوں کو اس طرح کھینچ رہی تھی جیسے دوسرے شاعروں کی اور ایسی ہی گھل رہی تھی جیسی دوسری شمعیں۔

یہ صفوی عہد کے شاعر تھے اور مقالہ نگار نے بہت دلچسپ انداز میں اس وقت کے ایران اور ہند کے تعلقات کو بیان کیا ہے، کیا گرم جوشی کا تعلق دونوں ملکوں میں تھا اور کس طرح مغلوں کی قدردانی کے سبب سے ایران کے باکمال اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آرہے تھے، اس ضمن میں بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں اور ان کے درباری امراء کا بیان ہے کہ علم اور ہنر کے کیسے قدرداں تھے اور کیسے اچھے شاعر کا منہ موتیوں سے بھر دیتے تھے۔ ہمایوں اور بیرم خاں کے اشعار میں مراسلت غرض کہ بڑے دلچسپ واقعات بیان ہوئے ہیں۔

ایرانی شعراء کے اسٹائل پر مغلوں کی سرپرستی نے جو اثر ڈالا وہ خاص طور پر یہ تھا کہ نرم و نازک عاشقانہ خیالات کو لطیف تر کیا اور رفعت پر پہنچایا، ہندوستانی الفاظ اور ترکیبوں کو فارسی میں اس طرح شامل کیا کہ وہ یک جاں ہو گئے۔

یہ بدقسمتی تھی کہ سلیم تہرانی کو شاہی سرپرستی نہیں ملی اور وہ درباری امراء سے وابستہ رہے شاید اسی لئے ان کے اشعار میں ناامیدی اور غم کی چاشنی ہے، معاصر شعراء کے اشعار جو مقالہ نگار نے لکھے ہیں وہ بے حد برمحل ہیں جب امراء کی مدح پر آتے ہیں تو بڑے

71

سلیقہ سے کرتے ہیں، جیسے ایران سے صائب نے امیر جعفر خاں کو اپنی مالی پریشانی کی طرف متوجہ کیا تو لکھا کہ ''دوستوں کو بخشش سے یاد کرنا ہی ہمت کی بات ہے ورنہ ہر درخت اپنے پاؤں ہی پر اپنے پھل گراتا ہے''، اس شعر کے صلہ میں صائب پانچ ہزار روپے انعام پاگئے۔

سلیم تہرانی نے ہندوستان میں رہ کر جن ہندوستانی الفاظ کو اپنایا اور بہترین استعمال کیا وہ پان ہے، اس سے پہلے خسرو نے ہندوی الفاظ کا استعمال کیا تھا اور بہت خوب کیا تھا، شاید یہ ہنر سلیم نے خسرو ہی سے سیکھا، سلیم تہرانی نے ایک آدھ مزاحیہ شعر بھی کہے ہیں مگر ان میں آورد ہے جیسے جسم خم ہوگیا ہے اور عصا کا سہارا ہے، اطفال کو میں کمان و تیر بیچتا ہوں۔

لیکن قنوطیت ہی ان کے اشعار کی صنعت ہے، ان سب باتوں کے باوجود برتری کا احساس غالب ہے۔

آگاہ نیست خضر ز احوال ما سلیم
عنقا کجاست تا بتر گوید سراغ ما

اس تمہید کے بعد مقالہ نگار نے جہاں جہاں سلیم تہرانی کے متعلق کوئی مواد پایا ہے اس کا ایک لمبا ذکر ہے اور سب فارسی میں ہے سوائے دو کے جو اردو میں ہیں، مقالہ نگار نے اس سلسلہ میں بڑی محنت کی ہے۔

سلیم تہرانی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اور معاصرین کے درمیان ان کے مقام کا بھی سیر حاصل بیان ہے، ہندوستان آنے کی وجوہات بھی تفصیل سے بیان ہوئی ہیں جن میں سے خاص وجہ احباب کی بے مروتی اور حسد تھی۔

ہندوستان آکر اس ملک سے جو محبت انھوں نے پیدا کرلی اس کا بیان بڑے خلوص سے ہے اور ان کے معاصرین کے اس سلسلہ میں اشعار بھی بہت نقل کئے ہیں۔

اسلام خاں جو سلیم کے مربی تھے ان سے تعلق کا بیان گو سرسری ہے مگر جذباتی ہے، چودہ برس تک یہ لوگ سفر اور حضر میں ساتھ رہے پھر دو برس کے اندر موت نے انھیں جدا کردیا۔

سلیم تہرانی نے شاعری کی پانچ شکلوں میں کمال حاصل کیا تھا، دس مثنویاں، بیس قصیدے، نوسو پچھتر غزلیں، ایک سو ایک رباعیاں مقالہ نگار کے نظر سے گزریں، جن کے مراجع کو مقالہ نگار نے باقاعدہ گنایا ہے۔

سلیم تہرانی نے تشبیہات اور استعاروں کا جو استعمال کیا ہے اس سلسلہ میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے سارے معاصرین کو پیچھے چھوڑ دیا، مولانا شبلی کی رائے کو مقالہ نگار نے رد کیا ہے کہ اس ہنر کے استعمال کا سبق سلیم نے اپنے معاصرین سے لیا ہے، انھوں نے سلیم، صائب اور غنی کاشمیری کے ہم معنی اشعار کو سامنے رکھ کر سلیم تہرانی کو سب پر ترجیح دی ہے۔

پھر بہت سے تاریخی احوال بیان ہوئے ہیں جو دلچسپ ہیں اور شاعر سے متعلق ہیں۔

مقالہ نگار کا سب سے بڑا کمال ان اشعار کا اکٹھا کرنا ہے جن میں محاورات کا استعمال ہوا ہے اور جن کی انھوں نے وضاحت کی ہے، یہ بڑی لمبی فہرست ہے اور حاصل مقالہ ہے۔

مقالہ نگار کو یقیناً اس بات کی مبارک باد دی جائے گی کہ جو کام انھوں نے پچاس سال پہلے کیا تھا اسے وہ سب کے سامنے لائے اور ریسرچ کرنے والوں اور اچھے مطالعہ کے لوگوں کو بہترین اشعار اور ان کے ماخذ تحفہ میں دئے۔ (پروفیسر وصی احمد صدیقی)

❁❁❁

انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں:
مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی کے قلم سے
''عارف باللہ حضرت شاہ علم اللہؒ پر ایک مضمون''

شعر و ادب

نور کے تڑکے میں

سید عبدالرب صوفی

میں نور کے تڑکے میں جس وقت اُٹھا سو کر
اللہ کی رحمت کے دروازے کھلے پائے

آتی تھی ندا پیہم جو مانگنے والا ہو
ہاتھ اپنے عقیدت سے آگے مرے پھیلائے

جو رزق کا طالب ہو میں رزق اسے دونگا
جو طالب جنت ہو جنت کی طلب لائے

جس جس کو گناہوں سے بخشش کی تمنا ہو
وہ اپنے گناہوں کی کثرت سے نہ گھبرائے

وہ مائل توبہ ہو میں مائل بخشش ہوں
میں رحم سے بخشوں گا وہ شرم سے پچھتائے

وہ کشت طلب بوئے، میں بارش رحمت ہوں
میں دیکھ نہیں سکتا کھیتی کوئی مرجھائے

یہ سن کے ہوئے جاری آنکھوں سے مری آنسو
قسمت ہے محبت میں رونا جسے آجائے

اے ابر کرم میری سوکھی ہوئی کھیتی ہے
گلزار تمنا پر رحمت کی گھٹا چھائے

آقائے گدا پرور سائل ہوں ترے در پر
میں اور تو کیا مانگوں تو ہی مجھے مل جائے

صوفی ہے ترا بندہ غفلت پہ شرمندہ
حاضر ہے ترے در پر سر شرم سے نہوڑائے

(مولانا) محمود حسن حسنی ندوی

کتابوں کی دنیا

نام کتاب: قانون اور انصاف کے نام پر عورت کی توہین
مؤلف: مولانا عبدالکریم پاریکھ
ناشر: فرید بکڈپو، دریا گنج نئی دہلی۔
قیمت: ۷/روپے پچاس پیسے

یہ ایک مشہور و معروف علمی و دینی اور فکری و دعوتی شخصیت کی کتاب ہے کہ جن کے قلم سے اسلامی تعلیمات پر اور دفاع اسلام پر کئی اہم کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، اور جن کا قرآن مجید کا آسان اردو زبان میں تشریحی ترجمہ منظر عام پر آچکا ہے، اور یہود کے تعلق سے اور گائے کے موضوع پر کہ اس کا اصل قاتل کون ہے، متعدد کتابیں سامنے آچکی ہیں اور اپنی اہمیت کو تسلیم کرا چکی ہیں، زیر تبصرہ کتاب بھی اپنے موضوع پر ایک انفرادی شان رکھتی ہے، غیر اسلامی معاشرہ اور سماج میں عورت کی مظلومانہ حیثیت کو بیان کرنے کے ساتھ اسلام نے اس کو جو حقوق و انصاف دیا اس کو بھی مؤلف نے اپنے دلچسپ انداز بیان اور موثر طرز استدلال کے ساتھ بیان کیا ہے، ۴۰ صفحات کے اس رسالہ نما کتاب میں اسی سلسلہ کی اہم معلومات کو بڑی خوبصورتی سے جمع کردیا گیا ہے۔

❁❁❁

نام کتاب: آسان آمدنامہ
مرتب: مولانا محمد امین صاحب
ناشر: مکتبۂ السعود اوگنی پور، سگرا اسندر پور، پرتاپگڈھ۔

زیر نظر کتاب فارسی قواعد کا رسالہ ہے، قواعد کی تعریفات، اصطلاحات و تعارف ساتھ میں امثلہ کے ذکر سے یہ آمدنامہ آسان بن جاتا ہے، طلباء کو اس کے ذریعہ سے فارسی زبان کے سیکھنے میں بڑی مدد ملے گی، اور یہ فارسی نصاب درس میں داخل کئے جانے کے لئے موزوں ترین کتاب ہے، صفحات ۶۴ ہیں، قیمت درج نہیں۔

❁❁❁

نام کتاب: اہل اللہ کی صحبت اہمیت و ضرورت
مصنف: حافظ زبیر احمد ملی
ناشر: مکتبۂ عامرہ، مالی گاؤں (مہاراشٹر)
قیمت: -/10 روپے

اہل اللہ کی صحبت کی اہمیت و ضرورت کا کون منکر ہوسکتا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم کی وجہ فضیلت ہی یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی صحبت اٹھائی اور صحابہ ان کا لقب پڑا، تابعین کی دوسروں پر فضیلت اسی لئے ہے کہ انہوں نے صحابہ کی صحبت اٹھائی اور ''کونوا مع الصادقین'' تو ارشاد ربانی ہے، پھر یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ دھواں والے کے پاس بیٹھو تو دھواں پاؤ گے، خوشبو والے کے پاس ہوگے تو مہکوگے، لیکن ان سب حقائق کے باوجود مادیت کے غبار نے ادھر پیش قدمی سے روک لگا رکھی ہے، ضرورت ہے اس غبار کو چھانٹا جائے، یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب نگاہ آخرت پر رہے گی دنیا پر نہیں، قلب پر رہے گی پیٹ پر نہیں، رسالہ میں ایجاز کے اسلوب کو اپنایا گیا ہے، حضرت مولانا علی میاں ندوی کے ایک مکتوب سے شروع کرکے انہی کے ایک مضمون پر ختم کیا گیا ہے، حضرت تھانویؒ کے اس قول کو بھی جگہ دی گئی ہے کہ اہل اللہ کی صحبت فرض عین ہے، کل ۳۲ صفحات ہیں۔

❁❁❁

نام کتاب: بطواف کعبہ رفتم
مؤلف: پروفیسر شعیب اعظمی

یہ ایک سفرنامہ حج ہے، مسافر حجاز مختصر سامان کے ساتھ اپنی اہلیہ کے ہمراہ حج کو گئے تھے ڈائری ساتھ تھی، مگر زیادہ وقت بیماری میں گزر جانے کی وجہ سے صرف چند مقامات مقدسہ کی زیارت سے بہرہ ور ہوسکے، ڈائری کے اکثر صفحات خالی رہ گئے، اچھے ادبی و شعری ذوق کے حامل پروفیسر صاحب نے اپنے تاثرات، احساسات و مشاہدات اپنی یادداشت سے قلمبند کیا، حافظ، غالب کے اشعار سے بآسانی مدد لی، اور یہ مفید سفرنامہ بھی لکھ ڈالا اور ۱۰۶ صفحات قلمبند کر ڈالے، نام ''بطواف کعبہ رفتم'' رکھا جو عراقی (۱۲۹۰ء) کی غزل کا ایک مصرعہ ہے، پیش لفظ اپنے مزاج شناس اور اکثر سفروں میں ساتھ رہنے والے (اس سفر کو مستثنیٰ کرکے جس کا یہ سفرنامہ ہے) باذوق و فاضل دوست پروفیسر عبدالودود اظہر ..... سے لکھوایا، اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱ حوض سوئیوالاں نئی دہلی نے اعلیٰ و معیاری طباعت کے ساتھ شائع کیا قیمت ۷۵ روپے رکھی۔

❁❁❁

نام کتاب: تمباکو اور اسلام
بقلم: حفظ الرحمٰن اعظمی مدنی ندوی
شائع کردہ: فرید بکڈپو لمیٹیڈ، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲
قیمت: -/50 روپے

فاضل مصنف کی یہ کتاب پہلے جامعۃ الہدایہ جے پور کہ جس ادارہ میں وہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، کے ریسرچ سنٹر سے شائع ہوئی پھر فرید بکڈپو نئی دہلی سے منظر عام پر آئی، ۱۸۴ صفحات ہیں اور معیاری طباعت ہے، کتاب میں تمباکو کی حقیقت اور اس کا علمی و تاریخی پس منظر اور اس کی طبی حیثیت کو جہاں بیان کیا گیا ہے وہیں اباحت و حرمت کے سلسلہ میں مسالک اربعہ کے علماء کے آراء بیان کی گئی ہیں، فاضل مصنف اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ بھی مکاتب فکر کے علماء کے مابین تمباکو کی حلت و حرمت کے بارے میں اختلاف رہا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق پایا جاتا ہے کہ مضر صحت چیز سے پرہیز کرنا چاہئے، اور اطباء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ مضر صحت ہے صرف استعمال کرنے والے کے لئے ہی نہیں بلکہ ان سب کے لئے جو اس فضا میں سانس لیتے ہیں، حرمت پر اتفاق نہ بھی ہو لیکن اسراف ہونے پر اتفاق ضرور ہے،

فاضل مصنف نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پورے دلائل کے ساتھ تمباکو اور اسی کے ضمن میں بیڑی، سگریٹ، حقہ وغیرہ کے مسئلہ پر بحث کی ہے معاشرہ سے اس وبا کو ختم کرنے کی ان کی یہ ایک کوشش ہے۔

❁❁❁

نام کتاب: داڑھی کی شرعی حیثیت
مصنف: حفظ الرحمٰن اعظمی مدنی ندوی
شائع کردہ: دارالکتاب اسلامی، ابراہیم پور، اعظم گڈھ
قیمت: -/15 روپے

داڑھی کے سلسلہ میں مسلمان افراط وتفریط کے شکار ہیں، زینت کے نام پر کترنے یا پھر داڑھی چھوڑے رکھنے کے مسئلہ کو پرے کر بالکلیہ چھوڑے رکھنا، اس میں توازن واعتدال کی ضرورت ہے اور وہ طریقہ نبوی سے ملے گا، مصنف نے اعفاء لحیہ سے متعلق مرفوع احادیث، صحابہ کرام کے تعامل، ائمہ اربعہ کے مسلک اور علماء متاخرین کے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے، امام غزالی کا قول نقل کیا ہے "داڑھی لمبی ہو تو ایک مشت سے زائد کا کترنا جائز ہے تاکہ حد سے نہ بڑھے"، اور عصر حاضر کے ممتاز عالم دین سید سابق کی کتاب "فقہ السنہ" سے نقل کیا ہے "کہ سنن فطرت میں سے ہے داڑھی بڑھانا اور اس کو چھوڑ دینا کہ زیادہ ہو جائے حتیٰ کہ وقار کی آئینہ دار ہو جائے بس اسے نہ اتنا کتروایا جائے کہ مونڈوانے کے قریب ہو جائے اور نہ ہی اتنا چھوڑ دیا جائے کہ وہ خراب لگنے لگے بلکہ متوسط بہتر ہے اس سلسلہ میں فتح القدیر سے مصنف نے عبارت نقل کی ہے اور ائمہ اربعہ وسادات تابعین کوئی بھی مطلق ارسال کے قائل نہ تھے، مصنف نے پورے دلائل وحوالوں کے ساتھ اس بارے میں صحیح اور معتدل مسلک کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں جو غلو ہو رہا ہے اس کا رد کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

❁❁❁

نام کتاب: مولانا ابواللیث ندوی کے قرآنی مقالات
مصنف: عمیر منظر
ملنے کا پتہ: فلاحی بکڈپو، بلریا گنج، اعظم گڈھ یوپی

جماعت اسلامی ہند کے ایک طویل عرصہ (۱۹۸۴ء-۱۹۹۰ء) تک منصب امارت پر فائز رہنے والے معروف عالم دین مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی علامہ سید سلیمان ندوی کے شاگردوں میں رہے ہیں، امام عصر مولانا علی میاں ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی ان کے رفقاء میں ہیں، مولانا مسعود عالم ندوی کی ان کے متعلق شہادت ہے کہ مولانا ابواللیث صاحب ندوی ان لوگوں میں ہیں جن کی قرآنی علوم پر گہری نظر ہے اور وہ ان مخلص علماء میں ہیں جن کی نظیر اس قحط الرجال میں ملنی مشکل ہے"

جناب عمیر منظر صاحب کی محنت لائق تحسین ہے کہ انہوں نے مختلف رسائل وجرائد کی فائلوں سے یہ مضامین نکال کر شائع کیے، قرآن اور ترتیب اسماء انبیاء کرام قرآن میں تکرار کی نوعیت اور قصہ آدم وشیطان، قرآن مجید اور سجع، قوموں کی ہلاکت کا سبب ایک آیت کی روشنی میں، سورۂ ہود اور سورۂ حجر کے متعلق استفسار کا جواب، اور قصۂ یوسف کا موازنہ، کتاب کے مندرجات ہیں، قیمت پچاس روپے ہے۔

❁❁❁

نام کتاب: "الاصلاح"
مرتب: آفتاب عالم خیرآبادی
ناشر: جمعیۃ الاصلاح لکھنؤ

جمعیۃ الاصلاح کے طلبہ کی انجمن ہے اس کا سالنامہ ادھر کئی سال کے وقفہ کے بعد شائع ہوا ہے، دارالعلوم کے ذمہ داران وسرپرستان، طلبہ کے مشرفین و اساتذہ کے پیغامات، طلبائے دارالعلوم کی علمی وثقافتی سرگرمیوں کا خبرنامہ، دارالعلوم کے شب وروز کی روداد اور ندوۃ العلماء کے تعلق سے معلومات اور طلبہ کی متنوع ومختلف موضوعات پر نگارشات میگزین کے مشتملات ہیں۔☆☆

پروف ریڈنگ صحیح نہ ہونے کی وجہ سے الاصلاح کا یہ سالنامہ اصلاح طلب بن گیا ہے، مرتب ناظم "الاصلاح" آفتاب عالم خیرآبادی سال گذشتہ ناظم جمعیۃ الاصلاح تھے، یہ سالنامہ بھی سال گذشتہ کا ہے۔

☆☆☆

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عربی زبان میں
مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء وصدر مسلم پرسنل لا بورڈ)
کی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوب کر لکھی ہوئی ایک نئی
اور دیدہ زیب ودلآویز تصنیف
فی ظلال السیرة
(علیٰ صاحبها الف الف تحية وسلام)
مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکی۔

انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آرہی ہے
تاریخ تدوین
سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
از
مولانا عبداللہ عباس ندوی
(معتمد تعلیم، ندوۃ العلماء لکھنؤ)
صفحات: ۱۸۷
تین ابواب پر مشتمل ایک ایسی کتاب جس میں تاریخی وتحقیقی ذوق کی تسکین بھی ہے اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حلاوت وشیرینی بھی۔
ناشر
دارالعلوم سبیل السلام، مدینۃ العلم حیدرآباد

Resi 2268177
Mob 95415002532
2000667
31268122
Shop : 2213736
2500667
سونے اور چاندی کی دنیا میں ۷۵ سالہ دیرینہ نام
حاجی صفی اللہ جویلرس
ہمارا نیا شوروم
گڑبڑجھالہ کے سامنے امین آباد لکھنؤ
پروپرائٹر : محمد اسلم
Haji Safiullah Jewellers
Opp. Gadbad Jhala, Aminabad, Lucknow.-18

Shop: 260890
Resi: 269562
MOHD. IRFAN
PROPRIETOR
NEW KAREEM JEWELLERS
نیو کریم جویلرس
دوکان نمبر ۱ بلدہ مارکیٹ ایک مینار مسجد کے سامنے اکبری گیٹ لکھنؤ

Ph: 2226657
FIT & Co.
Since: 1916
Specialist in
Suits & Sherwani
Near:- Sardar Sons,
At: Nazirabad, Lucknow

مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے زیر اہتمام شائع ہونے والے رسائل ومجلات ایک نظر میں

	رسائل	سن آغاز	زر تعاون: اندرون ملک	زر تعاون: بیرون ملک
۱	ماہنامہ البعث الاسلامی (عربی)	۱۹۵۵ء	۲۰۰ روپے	۳۰ ڈالر
۲	پندرہ روزہ الرائد (عربی)	۱۹۵۹ء	۷۵ روپے	۲۵ ڈالر
۳	پندرہ روزہ تعمیر حیات	۱۹۶۳ء	۱۵۰ روپے	۳۵ ڈالر
۴	انگریزی سہ ماہی Fragrance	۱۹۹۸ء	۱۰۰ روپے	۲۵ ڈالر
۵	ہندی ماہنامہ سچا راہی	۲۰۰۱ء	۱۰۰ روپے	۲۵ ڈالر

ان رسائل ومجلات کے ساتھ آپ کا تعاون فکری تعمیر اور شعور کی تربیت کے مشن میں تعاون ہوگا۔

خط وکتابت کا پتہ: پوسٹ بکس ۹۳، ندوہ لکھنؤ

بمبئی کے قارئین "تعمیر حیات" سے
ممبئی کے قارئین "تعمیر حیات" سے گذارش ہے کہ "تعمیر حیات" کے سلسلہ میں رقم جمع کرنے یا خریدار بننے کے سلسلہ میں ذیل کے پتہ پر رابطہ قائم کریں، وہاں ان کو رقم جمع کرنے کی رسید مل جائے گی۔
ALAUDDIN TEA
Tea Merchants
44, Haji Building, S.V. Patel Road,
Null Bazar, Mumbai 400 003
Tele: Add CUPKETTLE Tel.: 3460220, 3468708
Tel. (R) 3095852